فذاك النَّبيلُ الشيخُ أحمد حسن له ثناءٌ جميلٌ حلّ كلَّ الأقالم

تذکرۂ محسنِ قوم وملّت

حضرت اقدس مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ (م: ۱۳۳۷ھ)

(بانیٔ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک)

حسبِ ایماء

حضرت اقدس مولانا احمد بزرگ صاحب سملکی دامت برکاتہم

(مہتمم جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک)

کاوش

عبدالعلیم امراوتی

ناشر

شعبۂ تقریر وتحریر

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک، گجرات

تفصیلات

کتاب کا نام:.....تذکرۂ محسنِ قوم وملّت

کاوش:.....عبدالعلیم امراوتی

حسبِ ایماء:.....حضرت اقدس مولانا احمد بزرگ صاحب دامت برکاتہم

صفحات:.....۲۴۸

سن اشاعت:.....شعبان المعظم ۱۴۳۷ھ مطابق مئی ۲۰۱۶ء

ناشر:.....شعبۂ تقریر وتحریر جامعہ ڈابھیل

مسافروں سے کہو: رات سے شکست نہ کھائیں
میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے بھر کے چراغ

اسے ناقدریٔ عالَم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

فہرست

نمبر شمار	عناوین	صفحہ
۞	کون ہے یہ نوجوان؟	۱۱
۞	احوالِ واقعی	۲۵
	بابِ اول: حیات وخدمات	
۱	بانیٔ مرحوم کے زمانے میں گجرات وہندوستان کی دینی حالت	۳۸
۲	بانیٔ مرحوم کی ولادت اوراس وقت کے سیاسی حالات	۴۲
۳	کچھ ڈابھیل سملک کے بارے میں	۴۵
۴	سملک کی وجہِ تسمیہ	۴۶
۵	سملک کی دوسری وجہِ تسمیہ	۴۶
۶	سملک میں بزرگانِ دین کی آمد	۴۷
۷	بچپن کے کچھ احوال	۴۹
۸	زمانۂ طالب علمی	۵۱
۹	مکتبی تعلیم	۵۱
۱۰	حفظ قرآنِ کریم	۵۲
۱۱	اسکولی تعلیم	۵۳
۱۲	سملک سے کٹھور میں	۵۴

۱۳	مدرسہ انجمنِ اسلام کٹھور	۵۴
۱۴	کٹھور سے لاجپور میں	۵۷
۱۵	لاجپور سے دہلی وکانپور	۵۸
۱۶	مدرسہ حسین بخش کا تعارف	۵۸
۱۷	جامع العلوم کانپور کا تعارف	۵۹
۱۸	مدرسہ عبدالرب دہلی میں	۶۲
۱۹	مدرسہ عبدالرّب کا تعارف	۶۳
۲۰	مدرسہ امینیہ دہلی میں	۶۴
۲۱	عالمیت کی تکمیل اور استاذ کی اطاعت کا جذبہ	۶۵
۲۲	بیعت وسلوک	۶۸
	بانیٔ مرحوم کی خدمات	
۲۳	علمی خدمات	۷۲
۲۴	قیامِ جامعہ کی خشتِ اول	۷۳
۲۵	مدرسہ کی تعلیمی کیفیت	۷۷
۲۶	تجوید کا انتظام	۷۸
۲۷	خوش نویسی	۷۹
۲۸	طریقۂ تعلیم	۷۹

۲۹	اردو زبان	۸۰
۳۰	عصری تعلیم	۸۰
۳۱	مدرسہ کی معاشی حالت	۸۱
۳۲	چاول آٹے کی برکتی مٹھی	۸۱
۳۳	مدرسہ کے چندے کے لیے پتھر کھانا	۸۳
۳۴	مدرسہ کے لیے گھر کے زیورات	۸۴
۳۵	مدرسہ کی ابتدائی حالت	۸۵
۳۶	تبلیغی خدمات	۸۸
۳۷	ماہنامہ الدین کا اجرا	۸۸
۲۸	رسالہ ''الدین'' کی خدماتِ جلیلہ اور اس کے ذریعے فتنوں کا تعاقب	۸۹
۳۹	الدین کی نشر واشاعت کا دائرہ	۹۰
۴۰	الدین کی زبان اور اس کا اسلوب	۹۱
۴۱	الدین کے پلیٹ فارم سے ایک جرأت مندانہ اقدام	۹۲
۴۲	الدین کی نشأۃ ثانیہ	۹۴
۴۳	مطبع معین الدین کا قیام	۹۵
۴۴	کتب خانہ	۹۷
۴۵	تدریسی خدمات	۱۰۰
۴۶	مدرسہ کے لیے مستقل زمین کی خریداری	۱۰۲

۴۷	زمین کے انتخاب میں مولانا محمد علی جوہرؒ کا حصہ	۱۰۳
۴۸	زمین کی تقدیس کی گواہی اکابر کی زبانی	۱۰۴
۴۹	قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید	۱۰۵
۵۰	مسجد کی تعمیر	۱۰۷
۵۱	مطبخ اور ہال کی تعمیر	۱۱۰
۵۲	اشرفی بلڈنگ	۱۱۱
۵۳	اصلاحی خدمات	۱۱۳
۵۴	انجمن اصلاح المسلمین، سملک کا قیام	۱۱۵
۵۵	انجمن ناصر المسلمین ڈابھیل کی داغ بیل میں بانیٔ مرحوم کا حصہ	۱۱۷
۵۶	وعظ گوئی وفنِ خطابت	۱۱۸
۵۷	سیاسی خدمات	۱۱۹
۵۸	سفرِ افریقہ	۱۲۱
۵۹	سفرِ افریقہ کے مصائب کا سامنا اور آپ کی استقامت	۱۲۵
۶۰	افریقہ کی خدمات	۱۲۷
۶۱	مسجد کا قیام اور رفاہی خدمات	۱۲۷
۶۲	مصالحت بین المسلمین	۱۲۹
۶۳	مدرسہ تعلیم الدین کے لیے ایک عمارت کی خریداری اور اس کو ٹیکس سے محفوظ رکھنا:	۱۳۱

۶۴	جنوبی افریقہ کی کمیٹی برائے جامعہ	۱۳۲
۶۵	افریقہ میں ایک اور مدرسہ کا قیام	۱۳۳
۶۶	سفرِ آخرت	۱۳۵

باب دوم: اوصاف وکمالات

۶۷	اخلاص وللّٰہیت	۱۴۶
۶۸	امت کا درد وغم	۱۴۹
۶۹	حصولِ علم کا شوق اور علمی انہماک	۱۵۲
۷۰	علما کی قدردانی	۱۵۴
۷۱	خدمتِ علمِ دین	۱۵۵
۷۲	طلبہ پر شفقت اور اندازِ تربیت	۱۵۶
۷۳	دیگر اداروں کے لیے فکرمندی	۱۵۸
۷۴	مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تئیں جذبۂ خدمت	۱۵۹
۷۵	انصاف پسندی	۱۶۱
۷۶	اشاعتِ دین کی دُھن	۱۶۲
۷۷	توکل علی اللہ	۱۶۴
۷۸	ایمانِ کامل اور یقینِ محکم	۱۶۴
۷۹	تواضع وفنائیت	۱۶۶

۸۰	رجوع الی اللہ وانابت	۱۶۹
۸۱	صلاح وتقویٰ	۱۷۰
۸۲	دنیا سے بے رغبتی	۱۷۲
۸۳	دین سے لگاؤ	۱۷۳
۸۴	سادگی	۱۷۴
۸۵	معاملات کی صفائی	۱۷۵
۸۶	ہمت واستقلال	۱۷۶
۸۷	صبر وتحمل	۱۷۸
۸۸	ایثار وقربانی	۱۷۸
۸۹	معاد کے ساتھ معاش کی بھی فکر	۱۷۹
۹۰	اوقات کی حفاظت	۱۸۰
۹۱	دوراندیشی (قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید)	۱۸۱
۹۲	باطل کی سرکوبی کی فکر	۱۸۴
۹۳	جہدِ مسلسل وسعیٔ پیہم	۱۸۵
۹۴	حسنِ انتظام	۱۸۶
۹۵	مقبولیت	۱۸۷
۹۶	احمد نام کی جامعہ سے مناسبت	۱۸۹

باب سوم: اساتذہ، تلامذہ، خاندان

بانی مرحوم کے اساتذہ

۹۷	حضرت مولانا امیر الدین سملکیؒ	۱۹۶
۹۸	حضرت مولانا عبدالحق ہزارویؒ	۱۹۷
۹۹	حضرت مولانا صوفی احمد میاں لاجپوریؒ	۱۹۸
۱۰۰	حضرت مولانا اسحاق بردوانیؒ	۲۰۱
۱۰۱	حضرت مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھیؒ	۲۰۱
۱۰۲	حضرت مولانا امین الدینؒ	۲۰۴
۱۰۳	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ	۲۰۷
۱۰۴	حضرت مولانا ضیاء الحق دیوبندیؒ	۲۱۰

بانیٔ مرحوم کے تلامذہ

۱۰۵	مفتیٔ گجرات حضرت مولانا مفتی اسماعیل بسم اللہؒ	۲۱۳
۱۰۶	حضرت مفتی اسماعیل صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ	۲۱۷
۱۰۷	فخرِ گجرات حضرت مولانا علی محمد تراجویؒ	۲۱۸
۱۰۸	مرثیہ حضرت مولانا احمد حسن بھام مرحوم مغفور سملکی	۲۲۰

بانیٔ مرحوم کا خاندان

۱۰۹	بوہرہ قوم کی تاریخ	۲۲۶

۱۱۰	بانیٔ مرحوم کے والد بزرگوار	۲۲۷
۱۱۱	اخوان واخوات	۲۲۷
۱۱۲	زوجۂ محترمہ	۲۲۹
۱۱۳	بانیٔ مرحوم کی اولاد	۲۳۱
۱۱۴	پسری اولاد	۲۳۳
۱۱۵	دختری اولاد	۲۳۶
۱۱۶	اردو مرثیہ	۲۴۱
۱۱۷	عربی مرثیہ	۲۴۳
۱۱۸	مراجع ومصادر	۲۴۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کون ہے یہ نوجوان؟

چشمِ تصور وا کیجیے! ظاہری آنکھیں بند کر کے تخیُّل کی آنکھیں کھولیے، اور چلیے میرے ساتھ! کہاں؟ آگے نہیں، پیچھے چلیے! اور ایک دو سال نہیں، پورے ایک سو دس سال پیچھے چلیے! دیکھیے! یہ صوبۂ گجرات کے دو جڑواں گاؤں ہیں، ماضی کے جھروکے سے چند مناظر ملاحظہ فرمائیے:

گاؤں کے تالاب کا پچھلا حصہ سوکھا پڑا ہے، دکانیں سج رہی ہیں، ''آدم پیر'' کے عرس کی تیاریاں شباب پر ہیں، دن رات ایک ہو چکے ہیں، لیجیے! رجب کا مہینہ آ گیا، عرس شروع ہو گیا، آدم پیر کے نام پر منت ماننے والے میلوں کا سفر طے کر کے برہنہ پا آئے ہیں، مزاروں پر چادریں چڑھائی جا رہی ہیں، مجاور نذرانوں کے نام پر قوم کا خون چوس رہے ہیں، غریب گاڑھے پسینے کی پائی پائی جمع کر کے ''بابا'' کے قدموں پہ نچھاور کر رہا ہے، بدعقیدگی کی شکار عورتیں اپنے معصوم نونہالوں کو اٹھائے قطار اندر قطار کھڑی ہیں کہ پیر صاحب ''نظرِ کرم'' فرما کر قسمت جگا رہے ہیں، دست بوسی کے ساتھ قدم بوسی کا عمل بھی جاری ہے، گلاب کی خوب صورت پتیوں کا آنچل مزار پر بچھا ہوا ہے اور سجدوں پہ سجدے کیے جا رہے ہیں۔ تالاب کے ایک کنارے برگد کا درخت ''پیر و مرشد'' بنا بیٹھا ہے، منت کے مقدس دھاگے باندھے جا رہے ہیں، اسی بوڑھے برگد کے سایے میں ''محفلِ ناؤ نوش'' سجی ہوئی

ہے، صراحیاں سرنگوں ہیں، سبولنڈھائے جارہے ہیں، جام سے جام ٹکرارہے ہیں، ناپاک شراب (تاڑی)، مقدس زمزم کا پانی سمجھ کر حلق میں پے بہ پے اُنڈیلی جارہی ہے، آتشِ شراب، مے کشانِ محبت کے دل ودماغ سلگارہی ہے، ذہن ساتھ چھوڑ رہا ہے، نشہ طاری ہورہا ہے، یہ لیجیے! نشہ سر چڑھ کر بولنے لگا، مے خوارانِ بزم مدہوش ہوگئے، عاشقانِ شراب، شراب میں ڈوب گئے، دن بھر کا تھکا ہارا آفتاب بھی یہ مناظر دیکھ کر ڈوبا چاہتا ہے۔

رات کے سیاہ پردے فضائے عالم پر چھانے کو ہیں، میلے میں ٹھیلے روشن ہوگئے، قمقمے جل اٹھے، قندیلیں بیدار ہوگئیں، پورے تالاب میں چراغاں ہوچکا ہے، محفلیں سج رہی ہیں، قوالوں کی جماعتیں تالاب میں ہر تھوڑے فاصلے پر اپنے اپنے سامعین لیے بیٹھی ہیں، وقتِ مقررہ پر قوالیاں شروع ہوگئیں، شرکیہ اشعار گائے جارہے ہیں، ڈھول پر پے بہ پے تھاپ پڑ رہی ہے، انگلیاں سارنگی پر رینگ رہی ہیں، ''سماع'' کے نام پر ''موسیقی'' اور ''وجد میں جھومنے'' کے نام پر ''رقص'' ہورہا ہے۔

عجب افراتفری کا عالم ہے، جہالت وضلالت اور بدعات وخرافات کی اندھیریاں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں، اِس شبِ تیرہ وتار میں اِکّا دُکّا چراغ ٹمٹمارہے ہیں، جو زندگی بھر تاریکی سے دست بداماں رہ کر ''اب بجھے تب بجھے'' کا شکار ہیں، جہالت سے ناآشنا اس ماحول میں اور بدعات سے آلودہ اس فضا میں ایک چھبیس سالہ نوجوان اٹھتا ہے، جس کے دل کے نہاں خانوں میں ایمان ویقین کی شمعیں

جل رہی ہیں، علم وعمل کے ہتھیار سے مسلّح یہ جانباز میدان میں اترتا ہے، دین کے نام پر بے دینی کا گرم بازار اِسے تڑپا دیتا ہے، بدعات وخرافات کے تیر دل کو چھلنی کیے دیتے ہیں، جہالت وضلالت سے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے، نامساعد حالات میں جوان حوصلے نے کام شروع کر دیا، ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر سمجھایا، صحیح عقائد بتلائے، عرس میں گھوم گھوم کر کلمۂ حق بلند کیا، وڈیروں کے سامنے اپنی بات رکھی، نوجوانوں کو قربانی پر ابھارا؛ مگر یہ کیا! سمجھنا تو دور کی بات ہے، کوئی بات سننے کو تیار نہیں، مذاق اڑایا جارہا ہے، ہنسا جارہا ہے، ٹھٹھے کیے جارہے ہیں، گالیوں سے نوازا جارہا ہے۔

لوگ دین کی صحیح بات پر آباواجداد کی جاہلی رسوم کو ترجیح دیتے رہے، شریعت کا جنازہ نکال کر خرافات کو سینے سے لگائے رکھا، نوجوان نہ مایوس ہوا اور نہ ہی ناامید، اس لیے کہ اس کی عمر سے زیادہ اس کے ''حوصلے'' جوان تھے، اس صورتِ حال نے مزید رُلایا، تڑپایا، گھُلایا، پگھلایا؛ اس رونے، تڑپنے، بلکنے اور سسکنے کی برکت سے خدا نے اپنے اس بندے کو راستہ سُجھایا، فیصلہ ہوا کہ مدرسہ کھول کر علم کی روشنی عام کی جائے، اس کا نور بانٹا جائے؛ تاکہ جہالت کی تیرگی ختم ہو اور ضلالت کی تاریکی چھٹے۔

لیجیے! مدرسہ کھلنے جارہا ہے، سب سے پہلا مدرسہ ''نوجوان کا گھر'' قرار پایا، نونہالانِ قوم آتے گئے اور علم کا نور پاتے گئے، چھوٹا سا گھر تنگ پڑنے لگا،

مدرسہ اب گاؤں کی مسجد میں منتقل ہوا، ممتحن حضرات کی پسندیدگی اور تعلیمی معیار کی بلندی نے اس میں چار چاند لگا دیے، طلبہ کی تعداد بڑھتی رہی، نتیجہ میں اساتذہ بھی بڑھنے لگے، اب گاؤں کی مسجد بھی تنگ پڑنے لگی، مدرسہ کسی وسیع جگہ منتقل ہوا چاہتا ہے، جگہ کا انتخاب دور اندیش اکابر کے مشورے سے ہو گیا، اس کے خریدنے کو سرمایے کی ضرورت پڑی، ''جوان'' پھر آگے آیا اور سب سے پہلے اپنے گھر والوں کے زیور قوم وملّت کے قدموں پر نچھاور کیے، پھر قوم سے دردمندانہ اپیل کی، زمین خرید لی گئی، ظاہر بینوں کو چھوٹے سے مدرسہ کے لیے اس قدر وسیع زمین کی خریداری میں ''سرمایۂ قوم وملت کا ضیاع'' نظر آیا، اعتراضات کیے گئے، نکتہ چینی ہوئی، سوالات اٹھے، قوم وملّت کے اس مخلص خادم نے ان سب کا جواب یہ کہہ کر دیا: ابھی یہ کم ہے، اس سے بھی زیادہ زمین کی ضرورت ہوگی۔

پڑوس کے گاؤں کی غربی جانب عیدگاہ کے مقابل زمین پر مسجد تعمیر کر کے مدرسہ منتقل کر دیا گیا، اس چمنِ نو کی آبیاری کے لیے وہی ''جوان'' آگے بڑھا، جگر کے ٹکڑے اور دل کی قاشیں کھاد کے طور پر زمین میں ڈالی گئیں، خون پسینے سے سینچائی ہوئی، تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا، کسی گل چین نہیں ہے، ہر دم تگ ودَو میں مصروف ہے، ہر گھڑی اِدھر اُدھر بھاگتا پھر رہا ہے، پتھر کھا رہا ہے، گالیاں سن رہا ہے، طعنے برداشت کر رہا ہے، فاقے جھیل رہا ہے، لوگ اسے ''بھکاری'' کہہ رہے ہیں، دھکّے دے رہے ہیں، جھڑکیاں پڑ رہی ہیں؛ لیکن ''فنائیت کا یہ

پیکر‘‘ سب کچھ جھیل رہا ہے، صبر کے کڑوے گھونٹ پی رہا ہے، مجال ہے کہ لب پر شکایت کا ایک حرف بھی آیا ہو، اور حلق سے ایک آہ بھی نکلی ہو! اس ’’جوان‘‘ کا تو مسلک ہی یہی تھا:

اپنے لہو کو دھو کے پی، زخموں پہ زخم کھا کے جی
آہ نہ کر، لبوں کو سی! عشق ہے یہ دل لگی نہیں
سینے پہ تیر کھائے جا، آگے قدم بڑھائے جا!
یعنی زبانِ حال سے کہہ دے کہ: ہاں! ستائے جا

وہ جوان اپنی دُھن میں کام کیے جا رہا ہے، اُسے نہ صلے کی تمنا اور نہ ہی ستائش کی آرزو، نہ مخالفتوں کی پرواہ اور نہ معاندوں کا خوف، وہ ایسا ناخدا ہے جو مخالف سمت میں کشتی چلانا جانتا ہے۔ نامساعد حالات اور ناموافق ماحول میں مدرسہ شروع کرنا آندھیوں اور طوفانوں کے بیچ چراغ جلانے کے مترادف تھا:

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں		چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

دین کی روشنی پھیلانے کے لیے قربانی کی وہ کونسی قسم رہ گئی جو اِس جوان نے بہ صدق دل وجان پیش نہ کی ہو! مدرسہ کی عمارت کے لیے سرمایہ کی ضرورت پڑی تو بیوی بچوں کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ کر سمندر کا سفرِ پُرخطر کر کے افریقہ جا پہنچا، وہاں پہنچ کر بھی جہدِ مسلسل اور سعیٔ پیہم کا عمل جاری ہے، ہم وطن بھائیوں کو مدرسہ کی طرف متوجہ کیا، مسجد بنوائی، مدرسے کے لیے مکان خریدا، اور عجیب بات

یہ ہے کہ وہاں بھی ایک مدرسے کی بنیاد ڈال دی۔

قیامِ افریقہ کے دوران ذہن تو ہر وقت اپنے جلائے ہوئے چراغ کی طرف متوجہ رہتا، دل میں ہر گھڑی اپنے مدرسہ کی یاد بسی رہتی، اور طبیعت کی بے چینی کا عجب حال ہوتا کہ کس طرح اپنی کڑیل جوانی کا خون دے کر دین کی خدمت کر جاؤں! میں ایسا کچھ کیا کروں کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا دین دوبارہ زندہ ہو جائے! راتوں کی تنہائیوں میں اپنے رب سے مانگتا کہ: مولا! مجھے اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرما۔ دن کو مخلوق پر محنت کر کے تھکتا، اور رات کو خالق کے سامنے اپنے آپ کو تھکاتا، پیہم محنتوں اور لگاتار کوششوں نے کمر توڑ کر رکھ دی، اور عین جوانی میں ''چالیس سالہ'' یہ جوان اِسی فکر وغم اور درد والم میں تڑپ تڑپ کر نقدِ جاں ہار گیا، اور سچ پوچھو تو یہ وہ ''ہار'' ہے جس پر ہزاروں ''جیت'' نثار۔ جوان مر گیا، کھپ گیا، لُٹ گیا، لٹا گیا، شمع کے مانند پگھلتے پگھلتے فنا کے گھاٹ اتر تو گیا؛ لیکن ہمیشہ کے لیے ''زندۂ جاوید'' ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی میں کہا کرتا ہوگا:

زندگی شمع کے مانند جلاتا ہوں ندیمؔ	بجھ تو جاؤں گا؛ مگر صبح کر جاؤں گا

آیئے! اب دیکھتے ہیں اس ایک چراغ سے کتنے چراغ جلے؟ بادِ صبا کے اس جھونکے سے گلشن میں کتنے رنگا رنگ پھول کِھل اُٹھے؟ اس آفتاب سے کتنوں نے اکتسابِ فیض کیا؟ ہدایت کے اس انجم سے کتنے گم گشتۂ راہ منزل پا گئے؟ اور ماحول میں کیا عظیم انقلاب برپا ہو گیا؟ تاریخی شواہد وحقائق اور علما واکابر کے معاینہ

جات کی ایک طویل فہرست ہے، ہم ان سب کو چھوڑ کر اسی جوان کے ایک رفیقِ درس کا اقتباس پیش کرتے ہیں، تحریر فرماتے ہیں:

''واقف حضرات جانتے ہیں کہ اب سے بارہ تیرہ سال قبل تک گجرات کے عام مسلمان کس قدر پستی میں تھے! صحیح مذہبی تعلیم سے ان کو کس قدر نفرت تھی! رسومِ جاہلیت میں وہ جکڑے ہوئے تھے، ان کی اصلاح کے لیے اگر کوئی عالمِ ربّانی اس طرف آنکلتا تو اس سے برا ان کی نظر میں کوئی نہ ہوتا؛ لیکن یکا یک جامعہ کے قیام کے بعد ان لوگوں میں انقلاب آنا شروع ہوا، حق و باطل میں تمیز کرنا شروع کیا، شریعتِ حقّہ کے جادۂ اعتدال کی طرف قدم بڑھائے، اور رفتہ رفتہ بدعاتِ سیئہ سے نفرت اور سنتِ حسنہ سے محبت پیدا ہوئی، انھوں نے آنکھیں کھولیں اور گہری نیند سے بیدار ہوکر علمِ صحیح کی روشنی میں حق وصداقت کی راہ دیکھی، حق تعالیٰ نے بھی اُن کی اِس انابتِ صادقہ کو شرفِ قبولیت سے نوازا، تعصب وہٹ دھرمی کافور ہوئی، اور وہ ہر حق آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار نظر آنے لگے۔

تمام قریب وبعید کے قصبات ودیہات سے تقریباتِ شادی وغیرہ کے موقع پر اساتذۂ جامعہ کو مدعو کیا جانے لگا، اور ان حضرات نے بھی ہر اصلاح کے موقع سے فائدہ اٹھا کر ان تک حق وصداقت کی آواز پہنچائی، جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا، حتیٰ کہ متعدد جگہ کے سالانہ عرس تک بند ہوگئے، جو برسوں سے ایک رسمِ جاہلیت کے طور پر ہوتے چلے آتے تھے، حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی کامیابی اس

زمانے میں علما کو ہندوستان کے دوسرے کسی خطے میں نہیں ہوسکتی''۔

یہ کفرستان میں میری اذانیں	اندھیروں میں اجالا بولتا ہے

آپ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ انقلاب آفریں کارنامہ انجام دینے والا نوجوان کون تھا؟ یہ ماحول کو یکا یک پلٹا دینے والا مدرسہ کونسا ہے؟ وہ دوگاؤں کونسے ہیں جہاں کبھی بدعات وخرافات کے چمگادڑوں کا بسیرا تھا اور پھر ہدایت وسنت کی شمعیں جل اٹھیں؟ تو جانیے! کہ یہ گجرات کے دو جڑواں گاؤں ''ڈابھیل وسملک'' ہیں، اور مدرسہ کا نام ''جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک'' ہے، اور.....اور.....نوجوان اسی جامعہ کے بانی، محسنِ قوم وملت حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکی نوراللہ مرقدہ ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی نوجوان کی زندگی کے خفیہ گوشوں کو اجاگر کرتی ہے، تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو ملاتی ہے، اس کتاب سے جامعہ کے اوراقِ گم گشتہ کھل کر سامنے آجاتے ہیں، اور گوشۂ خمول میں رہنے والی اس شخصیت کا انقلابی پہلو نظر نواز ہوتا ہے۔

اسے بانیٔ مرحوم کا اخلاص کہیے یا ہماری غفلت، کہ ان کی وفات کے سو سال گذر جانے کے بعد بھی ان کی حیات وخدمات اور اوصاف وکمالات پر کچھ کام نہ ہوسکا، ایک صدی سے فضلائے جامعہ پر یہ قرض تھا جس کو چکانے کے لیے شعبۂ تقریر وتحریر کے ہونہار، سعادت منداور تربیت یافتہ طالب علم، ''الدین'' کے مدیر، عزیز القدر عبدالعلیم امراوتی (متعلم: عربی ہفتم) - سلمہ اللہ تعالیٰ

وعافاہ- آگے بڑھے، اور بساط بھر محنت وکوشش کرکے ایک ایسی شخصیت پر کتاب تصنیف کردی جن کے حالات پر کچھ لکھنا پختہ قلم کاروں کے لیے بھی آسان نہ تھا۔ چوں کہ یہ عاجز قدم بہ قدم ان کے ساتھ شریک رہا، اس کاوش کے پیش کرنے میں ان کو جو صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں وہ بھی میرے سامنے ہیں، اور پوری کتاب تین سے زائد مرتبہ پڑھ چکا ہوں، اس بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ قلم کی سلاست وسحر انگیزی، اسلوب وطرزِ نگارش کی جدت اور تحقیق ونکتہ آفرینی کے اعتبار سے یہ کتاب منفرد وممتاز ہے۔

راقم الحروف، عزیزم عبدالعلیم سلّمہ کو جملہ فرزندانِ جامعہ کی جانب سے ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے، اور دعا کرتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ اس کاوش کو شرف قبولیت بخشے، ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے، اور عزیزم کا یہ ''نقشِ اول''، مستقبل کے نقوش کا زینہ بنے؛ نیز بانیٔ مرحوم کے اس لگائے ہوئے پودے کو خوب سے خوب تر ترقیات نصیب ہو، نظرِ بد سے محفوظ رہے اور سدا شاد، باد اور آباد رہے۔ آمین

''بہ قامت کہتر اور بہ قیمت بہتر'' کی مصداق اس چھوٹی سی تحقیقی کتاب کو ممکن ہے کہ بعض قارئین طالبِ علمانہ کاوش سمجھ کر صرفِ نظر فرمادیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والے کے لیے یہ کتاب ''سنگِ میل'' کا کام دے گی۔ یقیناً جسامت وصفحات کے اعتبار سے بہت چھوٹی ہے؛ لیکن اہمیت

وافادیت کے اعتبار سے پی ایچ ڈی کے بھاری بھر کم مقالوں سے کسی طرح کم نہیں، ربِّ شاکر سے قوی امید ہے کہ مستقبل میں یہ کتاب خود کہے گی:

رخسارِ خوبرو پہ حسین خال کی طرح	تاریخ میں ہمارا بھی اپنا مقام ہے

اس کتاب کو پڑھ کر بانیٔ مرحوم سے غیر شعوری طور پر عقیدت ومحبت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا، آپ کی زندگی کا سب سے متأثر کن پہلو یہ ہے کہ: زندگی بھر جس چمن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی، اپنی حیاتِ مستعار کا نفَس نفَس جس گلستاں کی حفاظت وترقی کے لیے قربان کیا، جب موسمِ بہار کی آمد آمد ہوئی، جب خونِ جگر سے سینچا یہ گلشن برگ وبار لانے لگا، جب لہلہاتی فصل سے فائدہ اٹھانے کا موقع آیا، تو ما أسئلکم علیه من أجر کا نعرہ لگانے والا ملّتِ اسلامیہ کا یہ بے لوث خادم چپکے سے اپنے اس رب کے پاس چلا گیا جس کے متعلق وہ ہمیشہ إن أجري إلا علیٰ رب العالمین کے وعدے سنایا کرتا تھا۔ بانیٔ مرحوم کے ہم نام احمد فرازؔ نے پتہ نہیں یہ غزل کس کے لیے کہی تھی؛ مگر مجھے تو اس کے ہر ہر شعر میں بانیٔ مرحوم کی زندگی جھلکتی دکھائی دیتی ہے:

ستم کا آشنا تھا وہ، سبھی کے دل دُکھا گیا
کہ شامِ غم تو کاٹ لی، سحر ہوئی چلا گیا
ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آ گئی
وہ ایک دیا بجھا تو سینکڑوں دیے جلا گیا

سکوت میں بھی اس کے اک ادائے دل نواز تھی
وہ یارِ کم سخن کئی حکایتیں سنا گیا
اب اک ہجومِ عاشقاں ہے ہر طرف رواں دواں
وہ اک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا
دلوں سے وہ گذر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اُداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا
شریکِ بزم؛ دل بھی ہے، چراغ بھی ہے، پھول بھی
مگر جو ''جانِ انجمن'' تھا وہ کہاں چلا گیا!

اِس وقت جب کہ رات کے بارہ بج رہے ہیں، ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے، گاہے گاہے اِکّا دُکّا جھینگروں کی آواز سکوت توڑنے کی کوشش کرتی ہے، اور پھر وہی طویل خاموشی! راقم کے پردۂ تخیل پر جامعہ کی تاریخ کا ایک ایک درخشاں ورق کھلا ہوا ہے، اس کی عظمت ورفعت کے بلند مینار نظروں کے سامنے ہیں، اس کی خدمات کی وسعت نگاہوں میں گھوم رہی ہے، اس کے فضلا کی کاوشوں اور جاں فشانیوں کا نقشہ اپنی طرف کھینچے جا رہا ہے، اس کے تقدس کی قسمیں کھاتے ہوئے اکابر نظر آ رہے ہیں، قدسی صفات اسلاف کے اَنفاس کی خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی ہے، اس کی افادیت واہمیت اور رفعت وعظمتِ شان کے پرچم لہرا رہے ہیں، اس کے فرزندان باطل سے دو دو ہاتھ لیتے نظروں سے گذر رہے ہیں، حیرت انگیز قربانیاں

دے کر دین کی اشاعت وحفاظت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، کفر وشرک کی تاریکیوں میں ہدایت وسنت کی شمعیں جلا رہے ہیں؛ الغرض! ایک روشن وتابناک تاریخ ہے جس کے سامنے دل ونگاہ، عقل وخرد، قلب وجگر اور جسم وجاں سب جھکے ہوئے ہیں، سو سال گذر جانے کے بعد آج بھی جامعہ عظمتوں کے اسی ثریا پر فائز ہے، ترقی کی اسی دیرینہ رَوش پر گامزن ہے، آج بھی اس کے آسمان میں روشن ستارے گم کردگانِ راہ کے لیے نشانِ منزل بنے ہوئے ہیں، مشائخ کے انفاس کی خوشبو آج بھی مقناطیسی کشش رکھتی ہے، آج بھی اہلِ دل کی دکانیں سجی ہوئی ہیں اور مریضانِ عشق علاج کے لیے ہجوم کیے ہوئے ہیں، آج بھی اساطینِ علم وفضل، علوم کے جام لنڈھائے جا رہے ہیں، اور مے کشانِ علم کا تانتا بندھا ہوا ہے، اس کے رجالِ کار کی خدمات کا دائرہ آج بھی چھ براعظموں کو محیط ہے، اس کی متبرک فضا میں مجھ جیسا گنہ گار آج بھی وہی قدیم روحانیت رچی بسی پاتا ہے، دماغ ہے کہ اس کے علمی ولولوں سے متأثر اور دل ہے کہ اس کے علمی کارناموں سے مرعوب، اس کا ذکر چپے چپے، اس کا ڈنکا ہر چہار سو، اس کی خوشبو گلشن گلشن، اس کی روشنی کُو بہ کُو، اس کے تذکرے ڈگر ڈگر نگر نگر؛ غرض یہ کہ، جامعہ کی قابلِ صد رشک تاریخ کی ہیبت دل پر چھائی ہوئی ہے، اس کے بے لوث خدام کی عظمتوں کے سامنے قلم جھکا جا رہا ہے۔ راقم آثم گرد وپیش سے بے خبر اِن ہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک بانیٔ مرحوم کی سرگوشی سنائی دی:

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں، ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں، ہم نہیں ہوں گے
جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زلفِ جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں، ہم نہیں ہوں گے
ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبینِ دہر پہ جھٹکے گی افشاں، ہم نہیں ہوں گے
نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوعِ مہر کا جلوہ
سحر ہوجائے گی شامِ غریباں، ہم نہیں ہوں گے
ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں، ہم نہیں ہوں گے
کہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں، ہم نہیں ہوں گے
ہمارے بعد ہی ''خونِ شہیداں'' رنگ لائے گا
یہی سرخی بنے گی زیبِ عنواں، ہم نہیں ہوں گے

سرگوشی ختم ہوئی، ارد اگرد دیکھا تو کوئی نہ تھا، وہی ہُو کا سا سناٹا، اور وہی کسی شرارتی جھینگر کی آواز، پلک جھپکی اور آنکھوں کے کٹورے سے ایک موٹا سا قطرہ نکل کر چہرے پر لکیر بنا گیا:

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ	جتنے چراغ ہیں تیری محفل سے آئے ہیں

یکے از خادمانِ شعبۂ تقریر وتحریر
جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل
۱۰/رجب المرجب ۱۴۳۷ھ
بروز دوشنبہ، بہ وقت شب: ۱۲:۱۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احوالِ واقعی

حوالۂ قرطاس ہیں یہ سطور ربِّ ذوالجلال کی حمد وثنا سے لبریز اور جذباتِ تشکر وامتنان سے معمور دل ودماغ کے ساتھ کہ حضرت مولانا احمد حسن بھام نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ کے احوال وواقعات کے مجتمع کرنے کی خدمت اس ربِّ ذوالمنن نے اِس کمزور وناتواں، سراپا ضعف وعصیاں بندے سے لے لی، اپنی بے مائیگی اور صلاح وتقویٰ سے عاری زندگی کو دیکھ کر یہی خیال گذرتا ہے کہ یہ حقیر سی کاوش کسی کے کرم کا صدقہ تھی؛ ورنہ مسلَّمہ حقیقت ہے کہ ''قدم خود اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں''، اس کی سرگذشت آپ بھی پڑھیے:

شوال ۱۴۲۹ھ کی ایک شام تھی، عشا کی اذان ہورہی تھیں، جامعہ کے گیٹ کے سامنے ایک رکشہ رکی اور چند آدمیوں کا مختصر سا قافلہ ایک نوعمر لڑکے کو ساتھ لیے اترا۔ اجنبی چہرے، اوپرے درودیوار، بلب اور ٹیوب لائٹ کی روشنی میں سبز باغ میں سفید کبوتر سے نظر آنے والے کچھ ہیولے سامنے تھے، جامعہ کے گیٹ سے سادگی پھوٹ پھوٹ کر برس رہی تھی، نگاہ اٹھی اور ایک عبارت پر جا کر ٹھہر گئی، لڑکا سراپا حیرت بنا اُسے تکا جارہا تھا، وہ عبارت کیا تھی؟ ''بانیٔ جامعہ حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ''، ذہن میں خیالات کا تلاطم بپا تھا، اس قدر مشہور جامعہ؛ مگر خدایا! یہ گمنام شخصیت کون ہے؟ آیا صفحۂ گیتی پر حیات ہے یا

کسی گوشۂ زمین میں آسودۂ خاک؟ کچھ پتہ نہ تھا، بہرحال! جماعت کا وقت ہوا جارہا تھا؛ اس لیے مسجد کے ایک گوشے میں سامان رکھ کر نماز کی تیاری کی، عشا کے بعد یہ سب منظر ذہن سے اوجھل ہوا، کچھ شناسا چہرے نظر پڑے اور ادھر ادھر کی باتوں نے سب کچھ بھلا دیا۔

امتحان ہوا، پھر داخلہ ہوا، کتابیں ملیں، درس گاہ بھی دیکھی بھالی ہوگئی، عصر بعد تفریح کا طالبِ علمانہ معمول شروع ہوگیا؛ مگر روزانہ واپس آتے ہوئے جب گیٹ پر کندہ اس سطر پر نظر پڑتی تو وہی سوالات چند ساعتوں کے لیے ذہن کی اسکرین پر ابھرتے اور پھر مٹ جاتے۔ اتنی بات تو علم میں آچکی تھی کہ اس ہستی کو زندوں میں تلاش کرنا بے سود ہے، لمحات گذرنے میں دیر کہاں لگتی ہے! چند دنوں بعد وہی لڑکا گاؤں کے قبرستان میں کسی کی قبر تلاش کررہا تھا، فاتحہ پڑھنے کو بے چین تھا، کس کی قبر؟ وہی گیٹ پر کندہ نام؛ مگر اس بے چارے کو کون بتاتا کہ جس تربت کی تجھے جستجو ہے اُس کی تلاش میں صرف تالاب نہیں؛ بلکہ سات سمندر پار کرنا پڑے گا۔ درمیانِ سال میں اسے اپنے ایک استاذ کی مہربانی سے ''تاریخِ جامعہ'' کا سرسری مطالعہ میسر ہوا، اور سارے سوالات حل ہوتے چلے گئے، بات آئی گئی ہوگئی۔ اس نوعمر کو کہاں معلوم تھا کہ جس نام کے مسمّٰی کی تلاش اس نے اولاً زندوں میں کی، پھر مقبورین کو چھان مارا، اس کے صرف جسد یا صرف مزار کا سراغ لگا لینے پر اسے اکتفا نہیں کرنا ہے؛ بلکہ چند سالوں بعد طالبِ علمانہ کاوش کے طور پر اسی بے

مثل ہستی کی حیات پر مختصر سی روشنی بھی ڈالنی ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو معلوماتی پُرزوں کو اسی وقت سے کشکول میں جمع کرتا، اور موقع آنے پر ان ہی پُرزوں کو جوڑ کر اس عظیم المرتبت ہستی کی خدمت کی سعادت حاصل کرتا۔

بہر حال! قصہ مختصر! ۱۴۳۶ھ - ۱۴۳۷ھ کا تعلیمی سال شروع ہوا، عیدالاضحیٰ کی تعطیلات بھی گذر گئیں اور رختِ سفر باندھ کر وہی نوعمر لڑکا - جواب دورِ شباب سے گذر رہا تھا - احاطۂ جامعہ میں پہنچا، دروس کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، اچانک جامعہ کے جواں سال استاذِ محترم مفتی اویس صاحب زید مجدہ کا ذہن کہاں سے کہاں پہنچا! چند دنوں میں ۱۴۳۷ھ شروع ہونے والا تھا، ۱۴ر میں ایک کم کیا جائے تو ۱۴۳۳ھ بنتے تھے، اور یہی اس گمنام بزرگ کا سنِ وفات تھا، بس! پھر کیا تھا! مفتی صاحب زید مجدہ نے اپنے دوست واحباب سے اس کا ذکر کیا کہ: بانئ جامعہ کی وفات پر پوری صدی گذرنے جارہی ہے، اور ان کی شخصیت پر اب تک کچھ کام نہیں ہوسکا، موقع اچھا ہے، طلبہ کو تیار کر کے ایک مجلس کا انعقاد کرلیا جائے جس سے حضرت کی زندگی کے سبق آموز پہلو ہمارے سامنے آئیں۔ ''شعبۂ تقریر وتحریر'' اور ''النادی العربی'' کے طلبہ جمع ہوئے، اور طے یہ پایا کہ جداری پرچہ ''الدین'' اور ''عزائم'' کے مدیرین ایک ایک پہلو پر مواد جمع کر کے مقالہ تیار کریں، اور ''النادی العربی'' کے ذمہ دار عربی مقالہ تیار کریں۔

تیاری شروع ہوئی، دیکھا جارہا تھا کہ وہی لڑکا جو چند سال پہلے بانئ جامعہ

کو زندوں اور مُردوں کے بیچ تلاش کر رہا تھا، اب نئی پرانی کتابوں کے اوراق میں ان ہی کو تلاش کر رہا ہے، اسے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ: تجھے پوری زندگی کے احوال مختصراً جمع کرنے ہیں، جلسہ کی تاریخ آ گئی؛ مگر اس بے چارے کو ورق گردانی کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا، تہی دست جلسہ گاہ میں حاضر ہو گیا، اس کے ہم درس ومعاونین بڑھ چڑھ کر مقالے پیش کر رہے تھے، اور یہ حسرت کا مارا اُنھیں تک رہا تھا، اچانک مائک سے اعلان کیا گیا: ''بانیٔ جامعہ کی مکمل حیات پر ایک مقالہ تیاری کے مرحلے میں ہے، جو عن قریب آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا''، سن کر ہوش اڑ گئے، خدایا! تو ہی مدد فرما، ''عن قریب'' کی قید بڑی بھاری پڑی، چوں کہ اعلان ہو چکا تھا؛ اس لیے کچھ پراگندہ سطروں سے اوراق سیاہ کرنے تھے، تہیہ کر لیا اور جو کچھ بن پڑا تھا اسی کو آگے بڑھایا۔

چوں کہ اعلان ''شعبۂ تقریر وتحریر'' کے پلیٹ فارم سے ہوا تھا؛ اس لیے امید تھی کہ مقالہ زیادہ سے زیادہ شعبہ کے سالانہ اجلاسِ تقسیمِ انعامات تک تو تیار ہو ہی جائے گا؛ مگر اُف! خدا غارت کرے کاہلی اور سستی کو، سائے کی طرح پیچھے پڑی ہوئی تھی، سالانہ مجلس بھی ماہِ جمادی الاخریٰ میں منعقد ہو گئی، گذشتہ ہونے والے جلسہ کے مقالات اور اساتذہ کے بیانات وتأثرات ''بانیٔ جامعہ نمبر'' کے نام سے چھپ کر کتابی شکل میں آ گئے، کتاب کا اجرا بھی ہو گیا؛ مگر یہ بے چارہ کئی اسٹیشنوں سے گذرنے کے باوجود راہِ منزل ہی کو تکتا رہا، اس جلسہ میں بھی پوری قوت کے

ساتھ پرانے اعلان کا اعادہ کیا گیا، ادھر درسیات واسباق کی ہمہ ہمی اور امتحانِ سالانہ کا فکر بھی ساتھ ساتھ سوار ہوا، اور ''مولوی رجب صاحب'' بھی آدھمکے جن سے کسی زمانے میں طلبۂ مدارس بڑا خوف کھاتے تھے، اب تو اس بے چارے مضمون نگار کو بڑی فکر ہوئی، جوں توں کر کے کام مکمل کیا، بہت سا حصہ کمپوز ہو چکا تھا اسی میں اضافہ کر کے حتمی فیصلہ اور پختہ نیت کی کہ، اب مواد کی پونجی بھی ختم ہوگئی ہے؛ اس لیے مزید طول نہ دیتے ہوئے قلم کو روک لیا جائے، اور جو کچھ بن پڑا اُسے ہی منتظرین کے حضور پیش کر کے ایفائے وعدہ کر لیا جائے۔ بہر حال! کہنا یہی تھا کہ یہ صرف ایفائے وعدہ کی ایک سعی تھی؛ ورنہ اس راہ میں جو مشقتیں پیش آتی ہیں اہلِ نظر خوب واقف ہیں؛ مگر اس ظلوم وجہول نے ان کا احساس کیے بغیر چلنا شروع کیا تھا؛ اس لیے بار بار قدم لڑکھڑائے، تاخیر پہ تاخیر ہوتی رہی، ہمتیں ٹوٹیں، ان سب کے ساتھ خدا جانے صحت وتوانائی کو کیوں ناراضگی پیدا ہوئی! جو قدم قدم پر ساتھ چھوڑ دیتی اور بندۂ عاصی مایوسیوں کے جنگل میں بھٹکتا رہ جاتا، پھر کوئی ہاتھ دست گیری کرتا، چمکارتا اور ابھار کر راہ یاب کرتا۔ یہ ہاتھ کس کا تھا؟ ایک تو وہی مفتی اویس صاحب جن کے قلب میں یہ داعیہ پیدا ہوا، اور دوسرے کون؟ کاش! وہ اخفائے نام کا حکم نہ دیتے، خیر! مبہم ہی سن لیجیے! وہی جو خود کو بار بار ''یکے از خادمانِ شعبۂ تقریر وتحریر'' لکھتے رہے، ''حافظ، مولوی، مفتی'' کے پرشکوہ القاب کے بغیر ان کا قدرتی نام وہی ہے، جو صرف نام ہی نہیں، واقعی مجھ جیسوں کے لیے

پناہ گاہ بھی ہے۔

مواد کی فراہمی کر کے اول الذکر نے اور حسنِ تعبیر اور حسنِ ترتیب کی طرف رہنمائی کر کے ثانی الذکر نے لڑکھڑاتے قدموں کو جمایا۔ مولوی زکریا کے حوالے سے جو کچھ معلومات درج ہیں وہ اول الذکر کی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے، موصوف مولوی زکریا کے رُفقا اور ساتھیوں میں سے ہیں؛ نیز ثانی الذکر نے چند سطریں تحریر فرما کر اِن منتشر اوراق کی جلد بندی بھی کر دی، جن سے یہ سطریں یک گونہ وزن دار محسوس ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں حضرات کو دارین میں بہترین بدلہ نصیب فرمائے۔ آمین

ایک بات پیشِ نظر رہے کہ اس مقالے کی تیاری میں بے شمار مقامات پر قیاس آرائیوں سے کام لیا گیا ہے، کیوں کہ تاریخی وثائق کی کمی کا شدت سے احساس تھا؛ اس لیے اس میں خطا وغلطی کا قوی امکان ہے، وثائق کی دستیابی کے بعد جو کچھ صحیح ثابت ہو اِس کو تائیدِ ایزدی شمار کیا جائے؛ ورنہ خطا ونسیان تو انسان کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں ہی!!!۔

ان جذبات کے اظہار کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ: من لا یشکر الناس لا یشکر اللّٰہ (ترمذی: ۲/۱۷) کے مدِّ نظر اپنے اُن محسنین ومعاونین کا ذکر کر دوں جن کی توجہات سے یہ حقیر سی کاوش وجود میں آئی ہے:

سب سے پہلے میں حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کا شکر گزار ہوں

جنھوں نے مفتی اویس صاحب زید مجدہ کی تحریک پر مواد کی فراہمی میں بھرپور کوشش فرمائی، اگر آپ کی بارسوخ شخصیت درمیان میں نہ ہوتی تو یہ مواد بڑی مشکل سے مل پاتا۔ حافظ سلیمان لاکھی صاحب زید مجدہ کے ذریعہ جو مواد ملا ہے، وہ حضرت ہی کی کوششوں کا رہینِ منت ہے۔

حضرت الاستاذ مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم کے بھی بڑے احسانات رہے، آپ کو ''تاریخ کا بھنڈار'' کہا جاتا ہے، اگرچہ کم ہمتی کے سبب آپ سے خاطر خواہ استفادہ نہ ہوسکا، تاہم جو کچھ بھی حضرت نے تعاون فرمایا تہہِ دل سے ممنون ومشکور ہوں۔ اس سے بڑھ کر حوصلہ افزائی کیا ہوسکتی تھی کہ آپ نے پوری کتاب حرف بہ حرف سنی، دیکھی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے سایۂ عاطفت کو بہ عافیت تمام باقی رکھے اور آپ سے خوب استفادے کی توفیق بخشے۔ آمین

نیز حضرت الاستاذ مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ کا بھی بڑا احسان ہے، آپ ''مؤرخِ جامعہ'' کے لقب سے ملقب ہیں اور ''تاریخِ جامعہ'' پر کام فرمارہے ہیں، اس حقیر کاوش کا آپ نے بہ ذات خود مطالعہ فرمایا، مختلف مقامات پر ضروری حک واضافہ اور مفید مشوروں سے نوازا، جس سے کچھ نہ کچھ استناد کی خوبو اس میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ آپ کے نظر نواز ہونے کے بعد بھی اضافہ جات کا سلسلہ چلتا رہا، اور آپ ہمت افزائی فرماتے اور دعاؤں سے نوازتے رہے۔ اللہ

آپ کوان ذرہ نوازیوں کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔آمین

اسی طرح حضرت الاستاذ مفتی ابوبکر صاحب پٹنی مدظلہ العالی نے بھی مختلف مواقع پر یاددہانی، ہمت افزائی فرمائی، اور خوب خوب دعاؤں سے حوصلے کو مہمیز کرتے رہے۔اللہ آپ کو صحت وعافیت عطا فرما کر اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔آمین

حضرت قاری عبداللہ میاں سملکی مدظلہ العالی (مہتمم جامعہ اصلاح البنات، سملک) کا بھی شکر گزار ہوں، کہ انھوں نے بانیٔ جامعہ کے خاندان کے بارے میں معلومات سے بھرپور چارٹ عطا فرمایا، جس سے کافی مدد ملی۔اللہ تعالیٰ جناب کو اس کا بہترین صلہ نصیب فرمائے۔آمین

ایسے ہی وہ رفقائے درس اور ننھے منے معاون دوست بھی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے بار بار اپنا وقت فارغ کر کے ہاتھ بٹایا، ان میں سے کوئی تحریر نقل کرتا تھا تو کوئی کتابوں کو ادھر سے ادھر منتقل کرتا تھا، کوئی کمپوزنگ میں ہاتھ بٹاتا تو کوئی پروف ریڈنگ میں تعاون کرتا؛ غرض! ان حضرات کی لمبی فہرست اور ان کی معاونت کا طویل سلسلہ ہے، ربِّ ذوالمنن ان تمام کو اپنا مقبول بندہ بنا کر خدمتِ دین کے لیے قبول فرمائے، ان کی بہترین تربیت فرما کر اُنھیں دین کا پاسبان وسپاہی اور محافظ بنائے۔اٰمین بجاہ سید المرسلین!

اس مقالے کی تیاری میں جن بنیادی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اُن

کی فہرست آخرِ کتاب میں درج کردی گئی ہے، جن اساتذۂ کرام اور رفقائے عظام نے ان کی فراہمی میں تعاون فرمایا اللہ انھیں بھی خوب تر بدلہ واجر سے نوازے۔

خدایا! تو نے اس حقیر بندے کو اپنے جس مقبول و برگزیدہ بندے کے احوال وواقعات پر کچھ لکھنے کی توفیق دی ہے، اُس بندے کے اخلاص وایثار اور اخلاق واعمال کا کچھ شَمّہ مجھے بھی نصیب فرما۔ جن لوگوں کے تعاون سے یہ کتاب تیار ہوئی ہے اُنھیں بھی اِس دولت سے مالا مال فرما۔ جس نے جس قسم کا بھی تعاون کیا ہو، وہ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، اسے بہترین بدلہ دنیا وآخرت میں عطا فرما۔ اے پروردگار! اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما۔ باشندگانِ عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنا، جو کمی کوتاہی ہوگئی ہو اسے معاف فرما۔ خیر کے پھیلنے اور شر کے سمٹنے کا ذریعہ بنا۔ آمین، والصلاۃ والسلام علیٰ خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد وآله وأصحابه الذین بلّغُوا الدِّین، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین.

العبد الضعیف المفتقر إلیٰ عفو ربه اللطیف

عبد العلیم بن حافظ عبد الکلیم امراوتی

متعلم: عربی ہفتم، جامعہ ڈابھیل

۹/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ

بابِ اول

حیات و خدمات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام حمد وستائش اسی ذاتِ وحدہ لاشریک لہٗ کو زیبا ہیں جس نے کائنات کو پیدا کیا، انسان کو اشرف المخلوقات کا تمغہ عطا کیا اور انسان جب بھی گمراہی کی طرف بڑھا تو فوراً اپنی رحمت ومہربانی کا اظہار کرتے ہوئے اسبابِ ہدایت پیدا فرمائے۔ جب تک انبیاورسل صلوات اللہ علیہم کا سلسلہ منظور ہوا اسی کے ذریعہ گمراہی وضلالت کی تاریکی کو روشنی میں نہلایا گیا، بالآخر سرکارِ دوجہاں، سرورِ کونین، فخر الرسل، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلسلۂ نبوت پایۂ تکمیل کو پہنچا؛ مگر اسبابِ ہدایت دنیا میں وجود پذیر ہوتے رہے۔ چناں چہ جب جب جہالت وضلالت کی گھٹاٹوپ اندھیریاں چھائیں تو اس کے خاطر کبھی اولیائے کرام میدان میں آئے اور کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ کی خلوص بھری ضربوں سے ہدایت ومعرفت کے انوار بکھیرتے چلے گئے، کبھی علمائے اسلام کا معزز ومحترم قافلہ نمودار ہوا اور قرآن وحدیث کے برکات سے بندگانِ خدا کی دستگیری کرتا چلا گیا، کبھی مجاہدین کی ہمت وعزیمت سے لبریز جماعت اٹھی اور کفر وضلالت کے ایوانوں کو تہ وبالا کرتی چلی گئی، غرض اس خدائے رحمٰن ورحیم نے اپنی مخلوق کو کبھی بے یار ومددگار گمراہی کے دلدل اور ضلالت کی گھاٹیوں میں بھٹکتا نہیں چھوڑا۔

اسلام کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ خدائے بزرگ وبرتر کا یہ پاکیزہ دین ہمیشہ فتنوں کا شکار رہا ہے؛ مگر یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے

کہ ہزار فتنوں کے باوجود یہ دینِ متین پنپتا رہا، اس شجرِ طیب کی شاخیں برگ وبار لاتی رہیں اور انسانوں کو سامانِ ہدایت اور اسبابِ امن وامان فراہم کرتی رہیں۔ جب تک خدا کی نام لیوا اور محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دامن گرفتہ اقوام کا دنیا میں غلغلہ رہا تب تک تو اسلامی تعلیمات کے آگے قومیں جھکتی ہی رہیں؛ مگر اٹھارہویں صدی کے انقلابات کے بعد بھی یہ دین اپنی اسی ہیئت پر باقی رہا، حالانکہ یہ دور یورپی اقوام کے عروج واقبال کا دور تھا، صفحۂ ہستی سے اسلامی تعلیمات کو مٹا دینے کے منصوبے بنائے جارہے تھے، لگتا ایسا تھا کہ اسلام کا یہ تابناک سورج ایک ٹمٹماتے دیے کی شکل میں تبدیل ہورہا ہے، جو عنقریب بجھا چاہتا ہے؛ مگر چوں کہ دینِ اسلام ازل سے ہی قیامت تک کے لیے پوری انسانیت کا رہنما ورہبر طے ہو چکا تھا، اس کی حفاظت کا وعدہ خود خالقِ کائنات کر چکا تھا، لہذا اس نے ہر دور میں حفاظتِ دین کا نظم فرمایا، جس کی کچھ جھلکیاں زیرِ نظر سطور میں آپ پڑھیں گے:

بانیٔ مرحوم کے زمانے میں گجرات وہندوستان کی دینی حالت

چناں چہ جب ہندوستان میں آٹھ سو سالہ اسلامی حکومت زوال پذیر ہوئی تو اسلام کا یہ پرانا وقدیم برگد کمزور ونا تواں پودا نظر آنے لگا، جس کا راست اثر مختلف صوبوں پر پڑا۔ سرزمینِ گجرات آخر ہندوستان کا ہی ایک صوبہ تھا، اس پر بھی اس خزاں کے آثار نمودار ہوئے اور اُن شاہانِ گجرات کا رعب ودبدبہ گردشِ ایام کی نذر ہوگیا، جن کی علم پروری اور مذہبی رواداری کی بنا پر یہ سرزمین علوم

ومعارف کا خزینہ اور اسلامی شان وشوکت کا مظہر تھی، اس زوال کا لازمی اثر یہ ہوا کہ دین وعلمِ دین کا پُر بہار موسم رخصت ہوا، جہالت نے اپنے ڈیرے جمائے اور بدعت نے اپنا علَم بلند کیا۔

تاریخِ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (مرتبہ: مولانا فضل الرحمن اعظمی دامت برکاتہم) میں مرقوم ہے: ''ان نفوسِ قدسیہ کے دور کے ختم ہوتے ہی ہر طرف جہالت کی بھیانک اور خوفناک تاریکی چھا گئی، احمد آباد جو اسلامی تہذیب وتمدن کا سرچشمہ تھا؛ ایسا تباہ ہوا کہ پھر اسے پنپنا نصیب ہی نہ ہوا، اس کا وہ جاہ وجلال اور شان وشوکت- جو یادگارِ زمانہ تھی- تاریخ کے صفحات پر افسانہ بن کر رہ گئی، یہی شہر جو کبھی دارالعلم تھا دارالجہل بن گیا، لوگوں کے عقائد ایسے بگڑے کہ خدا کی پناہ! امورِ شرکیہ وبدعیہ دین کے ہر شعبہ میں رچ بس گئے، بہت سی باتیں جن کو دین سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا دین میں داخل سمجھی جانے لگیں، غرض جہالت کیا تھی! ایک وبا تھی جو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، جس میں اسلامی عقائد واعمال ڈھونڈے نہ ملتے تھے''۔ (تاریخِ جامعہ: ۳۶، مطبوعہ: پاکستان)

خود ڈابھیل، سملک کا حال حضرت مفتی محمد حفظ الرحمن صاحب سملکی مدظلّہ کے قلم سے پڑھیے ''ڈابھیل وسملک اس زمانے میں رسومات وبدعات کا گہوارہ بنے ہوئے تھے، سال بھر اہتمام سے عرسوں کا انعقاد، مزارات پر محافلِ فسق وفجور کا نظم ونسق وغیرہ وہ نامساعد حالات تھے، جن میں حق پرستوں کا سر ابھارنا،

ان کا پنپنا اور ظلم وبدعت کے ان اڈوں سے دو دو ہاتھ لینا؛ یقیناً شیر کی کچھار میں گھسنے کے مترادف تھا۔ پھر یہ سنگین حالات کچھ ڈابھیل، سملک تک ہی محدود نہ تھے؛ پورا خطۂ گجرات آتشِ توہمات کی لپیٹ میں آچکا تھا، ہر چار طرف ظلمات کا دور دورہ تھا، جس کا کچھ اندازہ علامہ کشمیریؒ کے اس مختصر سے واقعہ سے ہوسکتا ہے: جب آپؒ پہلے پہل سورت پہنچے تو آپ کی بزرگی اور پاک بازی سے متأثر ہوکر سورت کی جامع مسجد میں نماز پڑھانے کی خواہش کی گئی، آپ فریضۂ نماز ادا کرنے کے بعد ڈابھیل روانہ ہوگئے۔ اہلِ مسجد نے گو آپ کو جوشِ عقیدت میں شرفِ تقدم دے دیا تھا؛ مگر جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ یہ دیوبندی عقائد کے عالم تھے تو اظہارِ تنفّر میں مسجد دھلوائی گئی اور پورے علاقے میں شور مچ گیا''۔

(سیرتِ انور:۱۹ بحوالہ اجلاسِ صدسالہ:۷۸،۷۹)

سوویں سالانہ روئداد میں مذکور ہے: ''اس مدرسہ کے قیام کے زمانہ میں یعنی آج سے پورے ایک سوسال قبل ہمارا یہ وطن گجرات بھی دوسرے صوبوں کی طرح جہالت کدہ بنا ہوا تھا، بدعت زدہ تھا اور خرافات ورسومات کا شکار تھا''۔

(اجلاسِ صدسالہ:۱۰۷)

استاذِ محترم حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم نے اپنی دادی محترمہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان فرمایا کہ: ''ہر سال رجب کے مہینے میں ''آدم پیر کا عرس'' بڑے زور وشور سے منایا جاتا تھا جس وقت عرس ہوتا تھا اس سے پہلے

اس کی تیاری ہوتی تھی اور ڈابھیل کا یہ تالاب باون بیگھے کا تھا، پیچھے نگری کا علاقہ نہ تھا، یہ ہلکا سا تالاب تھا، زیادہ گہرا نہ تھا، روڈ کے قریب کے حصے میں پانی رہتا تھا، بارش کے موسم کے بعد پیچھے والا حصہ سوکھ جایا کرتا تھا، جب عرس کا زمانہ آتا تو تالاب کا پچھلا حصہ پورا دکانوں سے بھر جاتا تھا، اتنا بڑا عرس ہوتا تھا کہ بمبئی سے بھی دکانیں لگانے والے یہاں آتے تھے۔ جہاں آج جنازے کی نماز ہوتی ہے وہاں برگد کا درخت تھا اور وہیں تاڑی کا پیٹھا بھی لگتا تھا، لوگ تاڑی پینے میں مست رہتے تھے، لوگوں کی گھٹیوں میں تاڑی پڑی ہوئی تھی، جن کو اللہ نے بچپا یا وہی بچے تھے؛ ورنہ جوان اور بوڑھے سب مبتلا تھے، عرس میں شرکت کرنا گویا لازم تھا، یہ صرف مذہبی رسم ورواج نہیں؛ بلکہ ان کا عقیدہ بن گیا تھا''۔

(بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۵، ۱۶، ۸۱، ۸۲)

حضرت مولانا عبدالاحد قاسمی تاراپوریؒ فرماتے ہیں: ''خطۂ گجرات میں علم کے سوتے خشک ہوچکے تھے، قرآن وحدیث کے غلغلے خموش ہوچکے تھے، تدریسی مسندیں اٹھ چکی تھیں، درگاہیں مجاوروں کا مسکن بن گئی تھیں، دین کی تشنگی بجھ چکی تھی، بدعات وخرافات عوام کا اوڑھنا بچھونا بن چکے تھے اور صرف کشف وکرامات کے تذکرے ان کا منتہائے علم رہ گیا تھا اور گجرات کا ہر خطہ جہالت کی تاریکی سے سیاہ پوش تھا''۔ (اجلاسِ صدسالہ: ۲۰۳)

ان ناگفتہ بہ حالات میں گنے چنے چند صلحا تھے جو روشنی پھیلانا چاہتے

تھے، عثمانی خاندان کے اکابر بھی ان معدودے چند روشنی پھیلانے والوں میں شامل تھے، صوفی عابد میاں عثمانی کے ہمہ وقت ذکر کے نور سے بدعات کی وحشت ونحوست قدرے لرزاں رہتی، بعض گھرانوں میں ناظرہ قرآن کریم پڑھانے کا نظم تھا اور اکّا دکّا خانگی حفظِ قرآن کا بھی سلسلہ تھا، یہاں کے باشندے دینی اعتبار سے بڑے غیور واقع ہوئے تھے، مسلکاً پکے حنفی تھے، بدعات وخرافات کے باوجود مسلکی حمیت کا یہ عالم تھا کہ فرقۂ ضالہ سے بلا جھجھک ٹکرا جاتے تھے، دین سے دور ہونے کے باوجود دین کے سلسلے میں حسّاس تھے، مسلکی حمیت ہی کا نتیجہ تھا کہ سامردو کے اہلِ حدیث اور علمائے دیوبند سے خار کھانے والے مولوی حشمت علی بدعتی سے ایک زمانہ تک ان کی چپقلش رہی، (اس سلسلے میں دسیوں واقعات بھی یہاں ذکر کیے جاسکتے ہیں؛ تاہم مناسب یہ ہے کہ اس کے لیے استاذ محترم حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی دامت برکاتہم کے خامۂ گہربار سے نکلنے والی مفصل تاریخ جامعہ کا انتظار کرے)۔ یہ معدودے چند دینی آثار تھے جو ظلمات سے دست بہ گریباں رہتے تھے؛ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بدعات وخرافات اور فسق وفجور کا سخت غلبہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اکثر تاریخ نگاروں نے سکہ کے صرف اسی ایک رخ پر زیادہ روشنی ڈالی ہیں۔

بانیٔ مرحوم کی ولادت اور اس وقت کے سیاسی حالات

ایسے خطرناک ماحول میں اخلاص کے ایک پیکر، علومِ دینیہ کے بے لوث

خادم، جوشِ عمل کے جذبہ سے سرشار، عالمِ دردمند اور محسنِ قوم وملّت حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ کی ولادت ہوئی۔ یہ تقریباً ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء کی بات ہے، اس کے اگلے ہی سال ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو بانیٔ دارالعلوم قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی وفات ہوئی۔

(بیس بڑے مسلمان: ۱۴۲، مکتبۂ رشیدیہ لاہور)

گویا ایک بانی (جامعہ: جسے ''دارالعلوم دیوبند ثانی'' کہا جاتا ہے) دنیا میں آیا اور دوسرا بانی (دارالعلوم اول) اپنے اوصافِ جلیلہ کا وافر حصہ اس بانی کو دے کر رخصت ہوا۔

یہ زمانہ تحریکِ ریشمی رومال کا زمانہ تھا، بانیٔ مرحوم کی پیدائش کے ایام ہی میں اس تحریک کی بنیاد پڑی اور تقریباً چالیس سالہ کوششوں کے نتیجے میں ہندوستان آزادی کے خواب دیکھنے لگا؛ مگر ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کو ریشمی خطوط انگریزوں کے ہاتھ لگے اور یہ کوششیں کارگر نہ ہوئیں۔ پھر چند سالوں کے بعد ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء مطابق ۱۸ر ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو حضرت شیخ الہندؒ اسارتِ مالٹا کی چار سالہ صعوبتوں کو برداشت فرمانے کے بعد امتِ اسلامیہ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ (تحریکِ آزادی میں مسلم علماوعوام کا کردار: ۸۴، ۱۵)

ادھر ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء کو مدرسہ تعلیم الدین کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور بیس سال کے بعد یعنی ۱۳۴۶ھ میں یہ چھوٹا سا مدرسہ ''جامعہ اسلامیہ'' کی شکل

اختیار کر گیا۔ گویا جامعہ اپنی زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ: ۱۸۵۷ھ کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اگر دیوبند وجود میں آیا ہے تو تحریکِ ریشمی رومال کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے میرا وجود کافی ہے۔ چناں چہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ جامعہ اپنی بات میں کھرا اترا اور جنگِ آزادی میں شرکت کر کے بازی لے گیا، اسی کی کچھ تفصیل آگے ''سیاسی خدمات'' کے عنوان سے آرہی ہے۔

(جنگِ آزادی میں جامعہ کی خدمات کے لیے دیکھیے: اجلاسِ صد سالہ: ۱۸۱ تا ۱۸۶۔ بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۱۳ تا ۱۲۱۔ تاریخ جامعہ ص: ۳۵۲)

حضرت مولانا ابوبکر غازی پوریؒ کے مندرجۂ ذیل اشعار اسی کے غمّاز ہیں:

ہم جو آزاد ہیں تیرا کردار تھا		جب بچھایا گیا تختۂ دار تھا
دشمنِ قوم تجھ سے شرم سار تھا		تجھ پہ تن من فدا اے مرے جامعہ!

بہر حال یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عالمِ اسلام پیہم ناکامیوں اور اپنوں کی غداریوں کے باعث کراہ رہا تھا، تُرک ناداں خلافت کی قبا چاک کر چکا تھا، خلافتِ ترکی اپنا وجود کھو چکی تھی اور سیاست کے ساتھ ساتھ دیانت پر بھی زوال آرہا تھا۔ ان حالات میں ضرورت تھی ایک ایسی ہستی کی جو امت مسلمہ کے رِستے ناسور پر مرہم رکھتی اور دنیا میں علَمِ اسلام کو بلند رکھنے کی خاطر مضبوط ستون فراہم کرتی اور بانیٔ دارالعلوم حضرت نانوتویؒ کے قائم کردہ مشن کو آگے بڑھاتی۔ خدائے بزرگ وبرتر نے خزانۂ غیب سے اس کا انتظام کیا اور مولانا احمد حسن بھامؒ کی شکل میں اس

ہستی کو دنیا میں وجود بخشا۔

کچھ ڈابھیل سملک کے بارے میں

بانیٔ مرحوم کی ولادت تقریباً ۱۲۹۶ھ کو سملک میں ہوئی، آپ کے والد کا نام حسن پٹیل تھا، سملک اِس وقت ڈابھیل سے متصل نوساری ضلع کا ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ سورت کے جنوب مشرق میں تقریباً ۲۸ / ۲۹ کلومیٹر کے فاصلے پر یہ دونوں گاؤں آباد ہیں۔ یہاں سے جنوب مغرب کی سمت ایک قدیم شہر: نوساری - جو کسی زمانے میں پارسی قوم کا مرکز رہا ہے- تقریباً ۱۵ رکلومیٹر پر واقع ہے۔ جانبِ مغرب میں سورت سے بمبئی جانے والی ریلوے لائن پر مرولی نامی قریہ ہے، جو ڈابھیل سملک سے تقریباً ۶ رکلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔ سملک وڈابھیل دونوں گاؤں ملے جلے ہیں، درمیان میں قبرستان حائل ہے، دونوں گاؤں کا عقبی حصہ باعتبار آبادی متصل ہے۔ یہ بستیاں اسٹیٹ ہائیوے نمبر ۶ پر واقع مرولی (چاررستہ) چوراہے کو نیشنل ہائیوے نمبر ۸ پر واقع ویسما سے جوڑنے والی سڑک پر واقع ہیں۔ یہ سڑک جامعہ کے سامنے سے گذر کر ڈابھیل کے تالاب کے گرد نصف دائرہ بناتے ہوئے سملک میں داخل ہوتی ہے، اسی تالاب کے دوسرے کنارے پر گاؤں کا بڑا قبرستان واقع ہے۔ آزادی سے قبل سملک وڈابھیل گائیکواڑ (حکومت) یعنی ریاستِ بڑودہ کے ماتحت تھے؛ لیکن آزادی کے بعد کبھی ضلع سورت اور کبھی ضلع بلساڑ میں داخل رہے۔ فی الحال ضلع نوساری کا

ایک حصہ ہیں۔ان دونوں گاؤں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی دونوں جانب دو بڑے دینی ادارے قائم ہیں، ایک طرف ازہرِ گجرات جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین (ڈابھیل)، اور دوسری طرف مدرسہ اصلاح البنات (سملک) واقع ہے۔

(نقوشِ بزرگاں:۱/ ۷۳۔نقوشِ بسم اللہ:۱/ ۸۲)

سِملک کی وجہِ تسمیہ:

سِملک کی وجہِ تسمیہ حضرت مولانا احمد بزرگؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا قاری رشید احمد بزرگؒ بیان فرماتے ہیں، انھوں نے یہ وجہِ تسمیہ مولانا محمد نانا سملکی (فاضل جامعہ ڈابھیل تلمیذِ علامہ کشمیریؒ) کے والدِ محترم سے سنی ہے کہ: سملک اصل میں ''سیم لگ بھگ'' ہے۔''سیم'' گجراتی میں کھیت اور گاؤں کے کنارے کو کہتے ہیں اور ''لگ بھگ'' قریب قریب، ملتا جلتا اور مشابہ کے معنی میں ہے، کسی زمانہ میں یہ علاقہ غیر آباد جنگل نما علاقہ تھا، رفتہ رفتہ آبادی قائم ہوئی اور گاؤں بنا، اس لیے سملک کے معنی ہوئے ''کھیت کے قریب گاؤں''، اگر یہ وجہِ تسمیہ صحیح ہے اور قرائن سے صحیح ہونا معلوم ہوتا ہے تو قدرت کی ان کارفرمائیوں کو ملاحظہ کیجئے کہ خالقِ کائنات کو اس جنگل میں منگل بنانا منظور تھا، کسے معلوم تھا کہ یہی جنگل مسلمانانِ ہند بلکہ بیرونِ ہند کے لیے مشعلِ راہ اور کشتیٔ خضر بننے والا ہے۔(نقوشِ بزرگاں ۱/ ۷۳)

سملک کی دوسری وجہِ تسمیہ:

دوسری وجہ تسمیہ حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم یوں بیان فرماتے

ہیں کہ: سملک ''سیم'' اور ''لوک'' سے مل کر بنا ہے، دونوں گجراتی زبان کے الفاظ ہیں، ''سیم'' کے معنیٰ گاؤں اور ''لوک'' کے معنیٰ لوگ (باشندے)، کثرتِ استعمال کی وجہ سے سملک ہوگیا، یعنی گاؤں کے باشندے۔ دونوں وجہ تسمیہ نکات کے قبیل سے ہیں؛ ورنہ اصل وجہِ تسمیہ تک پہنچنا یقیناً کارے دارد ہے۔

تیسرا نکتہ اس نام میں یہ بھی نکالا جاسکتا ہے جس کو حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ: سملک میں ''سی'' ''سا'' کا مؤنث ہے اور ''ملک'' فرشتہ کے معنی میں ہے، تو معنی ہوئے ''فرشتہ کی مانند'' (قریۂ صالحین) ظرف بول کر مظروف مراد لیا جانا عام ہے، اہلِ دنیا؛ بڑے لیڈروں اور سیاست دانوں کی طرف اپنی آبادی اور سڑک کی نسبت کو فخر جانتے ہیں، صرف ایک مرتبہ اس جگہ کسی لیڈر کی آمد سے ہمیشہ کے لیے وہ آبادی اس وارد وصادر کی طرف منسوب ہوجاتی ہے، نہرو نگر، گاندھی نگر، آزاد روڈ وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ (نقوشِ بزرگاں ۱/ ۷۴)

تاریخ سے اس گاؤں میں بزرگان دین اور سلف کا آنا اور رہائش اختیار کرنا ثابت ہے۔ بعید نہیں کہ ان فرشتہ صفت انفاس قدسیہ کی وجہ سے گاؤں کا نام سملک پڑ گیا ہو۔

سملک میں بزرگانِ دین کی آمد

ایک طرف یہاں بدعات وخرافات کا وہ طوفان بپا تھا جس کا ذکر ما قبل

میں ہو چکا ہے، دوسری طرف ڈابھیل وسملک کی یہی وہ بستی ہے جس کو غوثِ صمدانی، پیرانِ پیر حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے احفاد واخلاف کا مسکن بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آپؒ کے خاندان کے کچھ بزرگوں نے مختلف ادوار میں اشاعتِ اسلام کی خاطر بغداد سے ہجرت فرمائی اور بلخ وبخارا پہنچے، پھر شمعِ اسلام کی روشنی بکھیرتے ہوئے ملتان تشریف لائے۔ وہاں سے ہندوستان کی طرف کوچ کیا اور بھروچ شہر میں سکونت اختیار کی، پھر سورت میں آبسے۔ سورت میں انہیں قبولِ عام عطا ہوا اور معتقدین کی تعداد میں اضافہ ہوا، اطرافِ سورت سے باشندگانِ سملک نے ان بزرگوں میں سے حضرت سید جعفرؒ کو سملک میں سکونت اختیار کرنے کی درخواست کی تو حضرت نے اپنے قدومِ میمنت لزوم سے اس بستی کو سرفراز فرما کر یہاں مستقل سکونت اختیار فرمائی، ان کی اولاد میں مولوی صوفی سید امیر الدین قادریؒ ہوئے، جنہوں نے اپنے فیض سے ان بستیوں کو مالا مال کر دیا، مولانا موصوف پورے ضلع سورت کی مسلم آبادیوں اور گھرانوں میں مقبول تھے، بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، روز وشب عبادتِ الٰہی اور تلاوتِ کلام ربّانی میں مشغول رہتے، نہ جانے اس گاؤں میں کتنے ہزار قرآن ختم کیے ہوں گے، سملک کی مسجد میں پنج وقتہ اور جمعہ کی نمازیں آپ ہی پڑھاتے تھے، گاؤں کے تین مشہور خاندان بھام، نانا اور وئید نے ان سے خوب استفادہ کیا اور رفاعیہ سلسلے میں ان بزرگ سے اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں سے

مرید ہوئے۔ (ملخص از نقوشِ بسم اللہ: ۱/ ۷۹ تا ۸۱)

ملّتِ اسلامیہ کے کئی ایک خدام سملک کی خاک سے اٹھے ہیں، خود بانیٔ جامعہ کے علاوہ مہتممِ جامعہ حضرت مولانا احمد بزرگؒ (اول)، ان کے فرزند حضرت مولانا محمد سعید بزرگؒ، حضرت مولانا عبدالحق سملکیؒ (بانیٔ اصلاح البنات ومجلسِ خدّام الدین) حضرت مولانا احمد درویشؒ وغیرہ بے مثال اکابرین نے یہاں جنم لیا ہے۔ نیز اِس وقت کے ایک جلیل القدر عالم دین اور بزرگ حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور دامت برکاتہم - جو قطب الاقطاب حضرت شیخ زکریاؒ کے صحبت یافتہ اور فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے جانشین ہیں اور ان کا فیض اطرافِ عالم میں اظہر من الشّمس ہے- اسی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں جامعہ کے موجودہ مہتمم صاحب اور کئی ایک اساتذۂ کرام اس بابرکت خاک کی دَین ہے، یقیناً اس کی زرخیزی میں بانیٔ مرحوم کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ نیز اس دھرتی پر ہمیشہ کثرت ذکر کا تسلسل رہا ہے۔ عثمانی خاندان کے بزرگوں کے علاوہ خود مولانا احمد بزرگؒ (اوّل) کے ذکر کی آواز کا تذکرہ اب تک سن رسیدہ افراد کی زبان پر ہے

بچپن کے کچھ احوال

بانیٔ مرحوم اپنے زمانے کی گمنام شخصیت تھی؛ نیز آپ میں اخفائے حال کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جو مخلصین کا خاصہ ہے؛ اس لیے ان کی زندگی کے مجموعی حالات زیادہ تفصیل سے نہیں ملتے۔ نیز ان کے بچپن کو کھول کر رکھنا بھی یقیناً

ایک دشوار ترین مرحلہ ہے؛ اس لیے کہ اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ بچہ جو آج گہوارے میں لیٹا ہے کل کو اس کے ہاتھوں تقدیرِ امم طے پانے والی ہے۔ بانیٔ مرحوم کے والد: حسن، بستی کے پٹیل یعنی چودھری تھے، نزاعی معاملات میں آپ کی طرف کثرت سے رجوع ہوتا تھا۔ نیک خیالی، بلند کرداری، نظم ونسق، مہمان نوازی، علما کی قدردانی آپ کے امتیازی اوصاف تھے۔ اُس وقت کے علما اور مشائخ جب اس نواح میں تشریف لاتے تو آپ ہی کا دولت کدہ ان کی قیام گاہ ہونے کا شرف حاصل کرتا تھا۔ (مستفاد از ذکرِ صالحین: ۲/ ۳۹۷)

اس پس منظر میں اندازہ لگائیے: بانیٔ مرحوم کا بچپن کتنا پاکیزہ، نورانی اور معصومیت سے لبریز رہا ہوگا، آپ کے گھر قیام کرنے والے علما ومشائخ کی زیارت اور ان کی دعائیں یقیناً آپ کو حاصل رہی ہوں گی۔ مرورِ ایّام نے آپ کے بچپن کو محفوظ نہ رکھا، ورنہ تصوّر یہی ہے کہ آپ کا بچپن بھی حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ کی طرح امت کی بے دینی پر کڑھتے، سسکتے اور روتے، بلکتے گذرا ہوگا۔ کاش! تاریخ کسی ایک واقعے کو بطونِ اوراق میں قید کر لیتی، جو تقویٰ وطہارت سے لبریز بچپن پر دلالت کرتا، جس سے جامعہ کے نونہالان روشنی حاصل کرتے اور اپنے محسن کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش وسعی کرتے۔ آخر کوئی تو بات تھی کہ اتنی کم عمری میں انہیں چھوٹے سے مدرسے کے قالب میں ''عالم کو سیراب کرتا ایک جامعہ'' نظر آتا تھا! کیا یہ دینِ اسلام اور حاملینِ اسلام کی

بے پناہ خدمت کے جذبہ پر دلالت نہیں کرتا؟

زمانۂ طالب علمی

مکتبی تعلیم:

اب آگے بڑھیے اور بانیٔ مرحوم کی طالبِ علمی کے زمانے میں قدم رکھیے: مستقبل میں ملت کا یہ بے لوث خادم بننے والا بچہ گاؤں کے مکتب میں داخل ہوتا ہے اور ناظرہ قرآن مجید اور ابتدائی اردو کی کتابیں پڑھ کر علمی منازل طے کرنے لگتا ہے۔ مولانا احمد بزرگؒ اپنے رفیقِ درس مولانا احمد درویشؒ کی وفات پر رقم طراز ہیں: ''ہم تینوں (مولانا احمد بھامؒ، مولانا احمد درویشؒ اور مولانا احمد بزرگؒ) نے شروع میں قرآن شریف اور پھر اردو کی تعلیم اپنی بستی کے مکتب میں ساتھ حاصل کی''۔ (روئداد ۱۳۵۴ھ ص: ۲ بحوالہ نقوشِ بزرگاں: ۱/ ۷۸، ۷۹)

اِس مکتب کے اساتذہ کون تھے؟ مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ، بانیٔ مرحوم کے رفیقِ درس مولانا احمد صاحب بزرگؒ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''قرآن مجید ناظرہ ختم کرنے کے بعد اردو پڑھی اور فارسی جناب مولوی سید امیر میاں صاحب سملکیؒ سے پڑھی''۔ (حیاتِ احمد: ۱۱) بانیٔ مرحوم، مولانا احمد بزرگؒ ہی کے ساتھ مکتب پڑھتے تھے؛ اس لیے دونوں کے استاذ مولوی سید امیر میاںؒ ہی ہوئے۔ یہ مولانا امیر میاں متقی پرہیزگار عالمِ دین تھے، طلبِ علم کا خوب شوق رکھتے تھے، آپ کا بچپن سورت میں گذرا، آپ کی وفات ۱۹/رجب ۱۳۴۹ھ

مطابق ۳۰؍دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہوئی، شہر نوساری کی ایک مسجد (قریشی محلہ کی مسجد نزد ٹاٹا ہائی اسکول) میں مدفون ہیں۔ (نقوشِ بزرگاں: ۱/ ۷۹)

یہ وہی مولانا امیر الدین ہیں جن کا ذکر سملک کے تعارف میں گذر چکا ہے اور جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے، یہی مسجدِ سملک کے امام بھی تھے اور مکتب کے استاذ بھی۔

حفظِ قرآنِ کریم:

بانیٔ مرحوم نے قرآنِ مجید حفظ کیا یا نہیں؟ اِس کا سراغ نہ مل سکا؛ مگر جیسا کہ حضرت مولانا علی محمد تراجویؒ نے حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہؒ کے تعلق سے فرمایا تھا؛ جب کہ مفتی صاحب انتہائی چھوٹے تھے اور قرآن مجید حفظ کر چکے تھے: ''یہ میری سمجھ سے باہر کی بات تھی کہ اتنی چھوٹی عمر کا لڑکا بھی حافظ ہوسکتا ہے''۔

(نقوشِ بسم اللہ: ۱/ ۵۱۳)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حفظِ قرآن کا رواج اتنا عام نہیں تھا جتنا آج کل ہے۔ مفتی اسماعیل صاحبؒ تو بانیٔ مرحوم کے شاگرد تھے، جب ان کے زمانہ میں یہ مزاج تھا تو خود بانیٔ مرحوم کے زمانۂ طفولیت میں حفظِ قرآن کے رواج کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے قرینِ قیاس یہ بات لگتی ہے کہ آپ حفظِ قرآن کی نعمت سے بہرہ ور نہ ہوسکے ہوں گے، بانیٔ مرحوم کے ہم وطن معاصر علما مولانا احمد بزرگ، مولانا احمد درویش اور مولانا مرغوب احمد لاجپوری رحمہم اللہ کے تعلیمی حالات میں بھی حفظ کا ذکر نہیں ملتا، اِس سے بھی ہمارے اِس خیال کی

یک گونہ تائید ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

اسکولی تعلیم:

بانیٔ مرحوم جس وقت ۱۳۱۴ھ میں لاجپور پہنچے اس وقت آپؒ کی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی، اس اعتبار سے اگر کٹھور میں تین یا چار سال گزارے ہوں تو کٹھور جانے کے وقت آپ کی عمر تقریباً چودہ یا پندرہ سال رہی ہوگی۔ مکتب کی تعلیم کے لیے یہ عمر بہت زیادہ سمجھی جاتی ہے؛ اس لیے خیال یہ ہوتا ہے کہ آپ نے عصری علوم کی ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی ہوگی۔ نیز انگریزی و گجراتی تعلیم کی اہمیت وضرورت کو محسوس کر کے اپنے مدرسے میں اس کو جاری کرنا اور رسالہ ''الدین'' میں اپنے گجراتی مضامین شائع کر کے تبلیغِ دین کی خدمت انجام دینا بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

ہمارے اس نظریے کی تائید حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے: بانیٔ مرحوم نے دین کی تعلیم کے ساتھ دنیا کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری کیا تھا، اُس وقت چھ تک اسکول پڑھنے سے سرکاری نوکری مل جاتی تھی، مولانا نے مدرسے میں باقاعدہ اسکول کی کلاسیں جاری کی تھیں۔ خود مولانا نے ایک موقع سے لکھا ہے: ہمارے مدرسے کی تعلیم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ یہاں کا فارغ یعنی دنیوی تعلیم حاصل کردہ شخص کسی سرکاری عہدے کے لیے درخواست دیتا ہے تو اس کی درخواست قبول کی جاتی ہے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۰۹)

سملک سے کٹھور میں:

بہر حال یہی طفلِ مکتب، مکتبی تعلیم کے مرحلے سے کامیاب وکامران گذر کر ''مدرسہ اسلامیہ کٹھور'' میں داخلہ لیتا ہے اور فارسی وابتدائی عربی سے آراستہ ہونا شروع کر دیتا ہے۔ خوش قسمتی کہیے کہ حسنِ اتفاق سے یہاں جس استاذ سے پڑھنے کی توفیق ملی: حضرت مولانا عبدالحق ہزارویؒ؛ وہ بھی مدرسۂ مذکور کے بانی تھے۔ گویا ایک بانی استاذ ہے، دوسرا بانی شاگرد ہے۔ یقیناً اس شاگردی کے دوران بنائے جامعہ کا جذبہ وولولہ غیر محسوس طریقے سے آپ کے جذبات وعزائم کا حصہ بنا ہوگا۔

مدرسہ انجمنِ اسلام کٹھور:

''کٹھور'' سورت سے جانبِ شمال میں ۲۲ کلومیٹر پر ایک گاؤں ہے، مولانا عبدالحق ہزارویؒ ضلع سرحد کے متوطن تھے، ۱۷/ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ میں کٹھور تشریف لائے اور پرب کی مسجد میں مقیم ہوئے، آپ ایک درویش صفت، صاحبِ علم اور اہلِ دل بزرگ تھے، آپ ترکیسر کے صاحبِ کشف وکرامت بزرگ، جنیدِ وقت حضرت موسیٰ جی پیرؒ کے مشورے سے کٹھور میں مقیم ہوئے تھے، بہت قلیل مدت میں آپ کی طرف لوگوں کا رجوع ہونے لگا، مولاناؒ نے اپنے معتقدین کے سامنے مسلمانوں میں دینی روح بیدار کرنے کے لیے قیامِ مدرسہ کی تحریک فرمائی، چناں چہ معتقدین اور اہلِ ثروت کی کوششوں سے یکم ربیع الاول ۱۳۰۷ھ مطابق ۲۵/ اکتوبر ۱۸۸۹ء بروز جمعہ ''مدرسہ انجمنِ اسلام'' کا مکتب کی

شکل میں وجود ہوا؛ مگر اخلاص کے ساتھ جلائی گئی یہ شمع ایسی روشن ہوئی جس کی روشنی نے دیکھتے ہی دیکھتے دور دراز سے علم کے پروانوں کو اپنے اردگرد جمع کرلیا اور بالآخر جناب الحاج محمد یوسف بھائی بھانا اور ان کے رفقا کے تعاون اور بے دریغ کفالت سے اس نے ایک مکمل دارالعلوم کی شکل اختیار کرلی۔

(حاشیۂ تذکرۂ فخر گجرات: ۳۸، ۳۹۔ نقوش بسم اللہ: ۱/ ۱۱۴)

مگر زمانے کی دست بُرد نے اس کو کیا سے کیا بنا دیا؟ اسی کی تفصیل جاننے کے لیے پڑھیے: حضرت اقدس مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم اپنی کتاب "أضواءٌ على تاريخ الحركة العلمية والمعاهد الإسلاميه والعربية في غجرات الهند" میں اسی مدرسہ کے بارے میں رقم فرماتے ہیں:

ومن سوء الحظ انتقلت إدارة الجامعة في عقود متوسطة من عمرها إلىٰ أناس كانوا يؤثرون العلوم العصرية على العلوم الإسلامية، فقل اهتمامهم بالعلوم الدينية وتركز على العلوم العصرية، فبدأت الجامعة تنحط وتضائل النشاط العلمي بها حتى اختفت عن الوجود ولم تبق لها باقية.

خلاصہ جس کا یہ ہے کہ: بدقسمتی سے یہ شاندار جامعہ درمیان کے چند سالوں میں گردشِ ایام کی نذر ہوکر اپنا اسلامی وجود کھو چکا تھا، وجہ کیا بنی؟ یہی کہ جامعہ کا انصرام وانتظام ان لوگوں کے قبضہ میں پہنچ گیا جن کو علوم عصریہ سے دل چسپی تھی، ان کی یہی سوچ وفکر اس قدر اثر انداز ہوئی کہ اس کی دینی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور یہ علومِ عصریہ کی آماجگاہ بن گیا۔

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

وکانت فی قریة کتھور مدیرة سورت مدرسة عربیة، استفاد کثیر من العلماء السورتیین من ھذہ المدرسة، وکانت فیھا مکتبة قیّمة مملوءة من شروح الحدیث والتفاسیر النادرة وغیر ذلک من العلوم الاسلامیة وقدضاع کثیر من الکتب النادرة وبعضھا نقلت الی مدرسة عربیة فی بولتن (برطانیة).

(أضواءٌعلی تاریخ الحرکة العلمیة والمعاھد الإسلامیه والعربیة في غجرات الھند: ۱۱۳)

حالاتِ زمانہ کی وجہ سے ایک صدی تک اس پر ایسا زوال آیا کہ اس کی حیثیت ایک چھوٹے سے مکتب کی سی رہ گئی؛ مگر عجیب اتفاق کہ پھر بانیٔ اول کے ہم نام مولانا عبدالحق صاحب عمرجی قاسمیؒ مقیمِ افریقہ کے ہاتھوں اس کی نشأۃِ ثانیہ عمل میں آئی، اِس وقت ماشاءاللہ یہ ادارہ ترقی کے منازل طے کررہا ہے۔

(حاشیہ ذکرِ صالحین: ۳۹۸)

بہرحال یہاں بانیٔ مرحوم نے کس قدر محنت وشوق سے وقت گزارا ہوگا؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ یہاں سے جب لاجپور (مدرسہ اسلامیہ الہیہ) کا رخ کیا تو درسِ نظامی کی اہم ترین کتابوں کو بڑی آسانی سے حل کرنے لگے۔ ظاہر سی بات ہے کہ غافل وسست طالب علم کے لیے یہ بات ہرگز ممکن نہیں ہے۔

کٹھور سے لاجپور میں:

مولانا احمد میاں لاجپوریؒ- جو صوفی سلیمان لاجپوریؒ کے فرزندِ ارجمند اور مولانا اسحٰق دہلویؒ (تلمیذِ رشید حضرت مولانا عبدالحق خیرآبادی) کے شاگرد تھے- نے لاجپور اپنے وطن میں ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں مدرسہ اسلامیہ کی تجدید کی، جوان کے والدِ بزرگوار نے بدعات کی بیخ کنی کے لیے اپنے علاقے میں ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں قائم فرمایا تھا اور گردشِ ایام (۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی) کی نذر ہوکر اپنا فیض کھو چکا تھا۔ اب مولانا احمد میاںؒ نے اس کی نشأۃِ ثانیہ کی، چوں کہ آپ تعلیم وتدریس کے باب میں ۱۳۲۰ھ سے قبل خصوصیت سے گجرات میں ممتاز تھے، اس لیے بانیٔ مرحوم ایسے کامل استاذ مولانا احمد میاںؒ سے استفادہ کے شوق میں کٹھور سے ۱۳۱۴ھ میں لاجپور چلے آئے۔ (باغِ عارف:۲۱)

یہی مولانا احمد میاںؒ ہیں جن کے دستِ بابرکت سے آپ نے جامعہ کا سنگِ بنیاد رکھا، چوں کہ مولانا احمد میاںؒ اپنے مدرسے کے مجدّد تھے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جامعہ کی بِنا کے جذبات واحساسات اس زمانہ میں دبے پاؤں بانیٔ مرحوم کے دل میں گھر کر گئے ہوں گے۔

لاجپور پہنچنے کے بعد آپ کی طالبِ علمانہ سرگرمیاں کیسی رہیں؟ اس کا اندازہ لگانے کے لیے اور بانیٔ مرحوم کے حصولِ علم کے ولولے اور شوق کا تصور کرنے کے لیے بانیٔ مرحوم کے رفیقِ درس مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ کا بیان

پڑھیے، لکھتے ہیں: ''حضرت الاستاذ (مولانا احمد میاں صاحبؒ) کے علمی ذوق و طرزِ تعلیم وشفقت نے طلبا میں تحصیلِ علم کا ولولہ پیدا کر دیا تھا، کامل چار سال کی مسلسل اور باقاعدہ تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ یہ جماعت صرف ونحو سے فراغت کے بعد فقہ میں ہدایہ اولین، حدیث میں مشکوۃ شریف، اصولِ فقہ میں نور الانوار، منطق میں شرحِ تہذیب تک پہنچ گئی۔ گویا آپ نے چار سال کی قلیل مدت میں درسِ نظامی کے اکثر حصہ کی تعلیم سے فراغت پالی۔

(ماہنامہ دار العلوم ۱۳۷۱ھ جمادی الثانی بحوالہ نقوشِ بزرگاں: ۱/ ۸۲)

لاجپور سے دہلی وکانپور:

مشکوۃ تک تعلیم ہوئی تھی کہ مدرسہ میں تعطل پیدا ہوا اور بانیٔ مرحوم اور ان کے رفقا کو استاذ کا بافیض در چھوڑ کر علمی سفر کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں؛ مگر جذبۂ صادق اور تڑپ ان صعوبتوں پر غالب آئی اور اُس زمانے کا پُر مشقت سفر طے کر کے ۱۳۱۸ھ میں آپ دہلی پہنچے، وہاں مدرسہ حسین بخش میں ایک سال تک پڑھتے رہے۔ (حاشیہ اجلاسِ صد سالہ: ۴۶)

مدرسہ حسین بخش کا تعارف:

یہ دہلی کا مشہور مدرسہ تھا اور مولانا محمد حسین فقیر دہلویؒ (خلیفہ ومجاز حضرت مفتی مظفر حسین کاندھلویؒ) کے مواعظ کا مرکز تھا۔ (الواح الصنادید: ۲/ ۲۲۳)

اسی مدرسے میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ایک خلیفہ مولانا کرامت

اللہ خانؒ نے مولانا محمد حسین فقیرؒ کے پاس رہ کر سالہا سال تک وعظ فرمایا۔

(الواح الصنادید: ۲/ ۱۱۳)

اسی مدرسے میں بانیٔ مرحوم کے استاذ حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھیؒ نے بھی درس دیا ہے۔ حضرت مولانا یحییٰ کاندھلویؒ، حضرت مولانا نذیر پالنپوریؒ اور حضرت مولانا احمد بزرگؒ نے بھی یہیں سے اکتسابِ فیض فرمایا ہے۔ بانیٔ مرحوم ۱۳۱۸ھ میں یہاں پہنچے اور مولانا محمد حسین فقیر ۱۳۲۴ھ میں دارِ فانی سے کوچ کر گئے؛ اس لیے عین قرینِ قیاس ہے کہ بانیٔ مرحوم نے یہاں ان سے اور مولانا کرامت اللہ خانؒ سے استفادہ کیا ہو، واللہ اعلم۔

بانیٔ مرحوم پھر جامع العلوم کانپور تشریف لے گئے، وہاں دو سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ (حاشیہ اجلاسِ صدسالہ: ۴۶)

جامع العلوم کانپور کا تعارف:

یہ وہ مدرسہ ہے جس کا وجود حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا رہینِ منت ہے۔ پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ کانپور میں حضرتؒ ۱۳۰۱ھ میں تشریف لائے اور ''مدرسہ فیضِ عام'' میں درس دینے لگے، تین چار ماہ بھی نہیں گذرے تھے کہ اہلِ مدرسہ نے آپ کی مقبولیت سے مالی فائدہ اٹھانا چاہا، خلافِ مزاج ہونے کی بنا پر حضرتؒ استعفا پیش کر کے گنج مرادآباد حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ادھر کانپور والوں کو اس خسارے کا احساس ہوا اور حضرت کو

دوبارہ دعوت دی، حضرت نے سابقہ مدرسہ میں قیام گوارانہ فرمایا؛ البتہ جامع مسجد پٹکاپور میں درس دینے لگے، اس طرح ایک نئے مدرسے کی بنیاد پڑی، جس کا نام خود حضرت ہی نے مسجد کی مناسبت سے ''جامع العلوم'' رکھا جو آج تک قائم ہے۔ اسی مدرسے کے قیام کے بعد ۱۳۰۷ھ میں حضرت تھانویؒ کو باطنی شغل سے اس درجہ دلچسپی بڑھی کہ سارے تعلقات سے دل سرد ہوگیا۔ اپنے شیخ سے ترکِ ملازمت کا مشورہ لیا؛ مگر جواب ملا'' بہ خلق اللہ فیضِ دینی رسانیدن راہِ قربِ وصول الی اللہ است'' مخلوقِ خدا کو دینی فیض پہنچانا بھی وصول الی اللہ کا راستہ ہے، گویا حضرت حاجی صاحبؒ کی توجہاتِ باطنی بھی اس مدرسہ کو حاصل رہی۔

۱۳۱۰ھ میں حضرت اپنے پیرومرشد کی ملاقات اور حج وزیارت کے قصد سے حجازِ مقدس روانہ ہوئے، چھ ماہ حضرت حاجی صاحبؒ کی صحبت سے استفادہ کے بعد جب کانپور پہنچے تو حلقۂ توجہ بھی منعقد فرمانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ سارا مدرسۂ کانپور ذاکر وشاغل بن گیا، اس کی اطلاع جب حضرت حاجی صاحبؒ کو ہوئی تو جواب آیا: ''ماشاءاللہ! آپ اور آپ کے متعلقین کے ذوق وشوق کی کیفیت سن کر طبیعت نہایت ہی خوش ہوئی، اللہ تعالیٰ بایں ذکر وشغل دائم رکھے، دن بدن ترقی درترقی عطا فرمائے، مقصودِ اصلی تک پہنچائے، آمین ثم آمین''۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ حضرت کو تعلقات سے وحشت شروع ہوئی اور دن بدن اس میں ترقی ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ کانپور جیسے محبوب مقام، اپنے قائم کردہ مدرسے اور درس

وتدریس سے بھی دل برداشتہ ہو گئے۔ حضرت حاجی صاحبؒ کی نصیحت ''اگر کبھی کانپور سے دل برداشتہ ہو جاؤ تو پھر توکّل بہ خدا تھانہ بھون ہی جا کر بیٹھ جانا'' پر عمل کرتے ہوئے بڑی حکمت کے ساتھ، پوری حسنِ تدبیر سے مدرسہ کو ہر طرح کے نقصان وحرج سے بچاتے ہوئے آخر صفر ۱۳۱۵ھ خوشی خوشی کانپور سے چل نکلے اور اپنی جگہ مولوی اسحاق صاحب بردوانیؒ کو مدرسِ اول بنایا۔

(مستفاد از بیس بڑے مسلمان: ۳۱۳، ۳۱۷ تا ۳۱۹)

تقریباً ۱۳۱۹ھ میں بانیٔ مرحوم کانپور پہنچے، پانچ سال قبل ہی حضرت تھانویؒ اپنے اس محبوب ادارے کو چھوڑ کر بہ ایمائے پیر ومرشد تھانہ بھون جا چکے تھے، حکیم الامت کے قائم کردہ نورانی اور علمی ماحول میں بانیٔ مرحوم نے اپنی علمی اور روحانی منازل طے کی ہیں، جس سے آپ کی اندرونی کیفیت اور خوابیدہ صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت تھانویؒ ہی کی برکات رہی ہوں گی کہ بانیٔ مرحوم کے قائم کردہ ادارے کے ذریعہ بدعات وخرافات کا سلسلہ اپنے انجام کو پہنچا اور اس نواح میں کبھی اسے دوبارہ پنپنا نصیب نہ ہوا۔

کانپور میں کن فنون کی تعلیم کن کن اساتذہ سے حاصل کی معلوم نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے مولوی اسحاق بردوانیؒ سے یہاں استفادہ کیا ہو، جو حضرت تھانویؒ کے تجویز کردہ ''صدر مدرس'' تھے۔ کانپور میں مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ بھی آپ کے ہم درس رہے۔ تاریخِ جامعہ میں مذکور ہے کہ: مدرسہ لاجپور میں تعطل پیدا

ہوجانے کی وجہ سے آپؒ ۱۳۱۹ھ میں کانپور گئے اور جامع العلوم میں داخلہ لیا، ۱۳۲۰ھ میں طاعون کی وجہ سے دہلی چلے گئے۔ (تاریخِ جامعہ:۳۲۶)

اسی طاعون کی وجہ سے بانیٔ مرحوم بھی مولانا لاجپوریؒ کے ساتھ کانپور سے دہلی چلے آئے ہوں گے۔ حضرت مولانا تجمل حسین فضلی مشہدیؒ رفیقِ بانیٔ مرحوم اسی کانپوری کی طالب علمانہ زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

طالبِ علمانہ وہ ہندوستان میں پھرتے رہے
رہنمائی کے لیے ملتے تھے شیخ وبرہمن
جب سیاحت سے تھکے ماندے ہوئے ہیں آپ
تب کانپور آخر ہوا ان کے لیے مثلِ وطن

''مثلِ وطن'' کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ آپ کو کانپور سے خاصا لگاؤ تھا، تقدیرِ الٰہی سے طاعون کا مرض پھیل گیا؛ ورنہ لگتا ایسا ہے کہ بانیٔ مرحوم یہیں سے اپنی علمی تشنگی بجھانے کا پختہ ارادہ کر چکے تھے۔

مدرسہ عبدالرّب دہلی میں:

دہلی آکر مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ تو دیوبند گئے اور بانیٔ مرحوم نے مدرسہ عبدالرب میں داخلہ لیا، کچھ دن بعد مولانا لاجپوریؒ بھی مدرسہ عبدالرّب چلے آئے اور وہیں سے ۱۳۲۳ھ میں فراغت حاصل کی۔ اس مدرسہ میں حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھیؒ صدر مدرس تھے، جو حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے مخصوص

تلامذہ میں سے ہیں، ان سے بھی دونوں حضرات نے استفادہ فرمایا۔ یہ تقریباً ۱۳۲۰ھ کا واقعہ ہوگا۔ اس وقت سے لے کر فراغت تک کا زمانہ بانیٔ مرحوم نے دہلی ہی میں گزارا۔ حضرت مولانا تجمل حسین فضلی مشہدیؒ فرماتے ہیں:

بعد اس کے شہر دہلی میں رہے ہیں مدتوں
یعنی وہ دہلی جو واقع ہے بہ دریائے جمن

مدرسہ عبدالرّب کا تعارف:

اس مدرسے کو مولوی عبدالرّبؒ واعظ نے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے مشورے سے شروع فرمایا تھا۔ اپنی چہیتی بیٹی کے نام پر دہلی میں مسجدِ آسیہ بیگم تعمیر کرائی اور اسی مسجد میں اس مدرسے کی بنیاد ڈالی، مولوی صاحب کا خاص مشغلہ وعظ کہنا تھا، ان کا انتقال ۱۳۰۵ھ میں ہوا۔ ۱۳۲۰ھ میں ہمارے بانیٔ مرحوم مدرسہ عبدالرب میں داخل ہوئے؛ اس لیے مولوی عبدالرّب کی زیارت یا ان سے براہِ راست استفادے کا موقع تو نہیں ملا؛ البتہ حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھیؒ- جو صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے- ان سے خوب استفادہ کیا۔ بانیٔ مرحوم کے رفیقِ درس حضرت مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ اور حضرت مولانا نذیر صاحب پالنپوریؒ اسی مدرسے کے فارغ ہیں، اور اسی مدرسے میں شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے مولانا عبدالعلیؒ سے حدیث پڑھی ہے۔

(مستفاد از الواح الصنادید: ۲/ ۹۳۔ بیس بڑے مسلمان ص: ۶۰۲۔ سوانحِ نذیری ۱/ ۳۹)

مدرسہ امینیہ دہلی میں:

نہ جانے کیا وجوہات پیش آئیں کہ آپ یہاں سے مدرسہ امینیہ منتقل ہو گئے، جو دہلی کی سنہری مسجد چاندنی چوک میں قائم ہوا تھا اور ۱۳۳۴ھ میں مسجد پانی پتیان کشمیری دروازہ میں منتقل ہو گیا۔ مدرسہ امینیہ کو مولانا امین الدین صاحب اورنگ آبادیؒ نے ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ میں قائم فرمایا تھا، جس میں اپنے رفیقِ درس علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو صدر مدرس مقرر کیا؛ مگر خانگی مسائل (بھائی کی وفات) کی بنا پر علامہ کشمیریؒ ۸/ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کو اپنے والدِ محترم کے حکم سے وطن تشریف لے گئے؛ لہذا مولانا امین الدین صاحبؒ نے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کو ۱۳۲۱ھ میں صدارتِ تدریس کا عہدہ سونپا، اس وقت آپ ''صدر مدرس'' کے ساتھ ساتھ ''شیخ الحدیث'' اور ''صدر مفتی'' بھی تھے①۔

① الواح الصنا دید ۱/۲۵۰ میں جناب مولانا عطاء الرحمن قاسمی نے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی آمد کا سال ۱۳۲۷ھ تحریر کیا ہے اور پھر ۱۳۳۰ھ میں مسندِ صدارت پر فائز ہونے کا تذکرہ کیا ہے؛ مگر یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا؛ اس لیے کہ خود انھوں نے اپنی دوسری کتاب ''دلی کی تاریخی مساجد: ص/۲۹۸'' میں یہ بات لکھی ہے کہ مدرسہ امینیہ کے قیام ۱۳۱۵ھ سے ساڑھے چار سال تک علامہ کشمیریؒ وہاں درس دیتے رہے، پھر وطن کشمیر تشریف لے گئے تو مولانا امین الدین نے حضرت مفتی صاحب کو ''صدر مدرسی'' کے لیے مجبور کیا۔ اس اعتبار سے معلوم ہوا کہ ۱۳۲۱ھ میں مفتی صاحب ''صدر مدرس'' بن کر آئے، گویا آمد وصدارت بیک وقت ہوئی اور ''الواح الصنا دید'' میں اس کو الگ الگ بیان کیا ہے، نیز سنین کا تفاوت بھی ملاحظہ ہو؛ اس لیے ہم نے ''بیس بڑے مسلمان'' میں مذکور حافظ سید رشید احمد ارشد صاحب کی تحریر پر اعتماد کیا ہے؛ نیز مختصر تاریخِ مدرسہ امینیہ ص: ۱۴ اور ص: ۳۳ پر صراحت ہے کہ ۱۳۲۱ھ میں مفتی صاحب دہلی تشریف لائے، ''الجمعیت'' کے خصوصی شمارے ''مفتیٔ اعظم نمبر'' ص: ٦٤ پر بھی یہی تاریخ درج ہے۔

اس زمانہ میں مولانا ضیاء الحق دیوبندیؒ، مولانا عبدالقادر ہزارویؒ، مولوی محمد قاسم دیوبندیؒ اور مولوی سید انظار حسین صاحب ہنس پوریؒ مدرسہ کے مدرسین تھے۔ بانیٔ مرحوم نے ان ہی بزرگوں سے تعلیم حاصل کی ہوگی۔ ان بزرگوں کا اخلاص دیکھیے کہ سب نے رضا کارانہ طور پر بلا معاوضہ مدرسہ میں کام شروع کر دیا تھا، اس وقت ان میں سے کسی کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں تھی، بانیٔ جامعہ نے ان ہی بزرگوں سے اخلاص کی بے پناہ دولت پائی ہوگی۔

عالمیت کی تکمیل اور استاذ کی اطاعت کا جذبہ

۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں مدرسہ امینیہ کا سالانہ جلسۂ تقسیمِ اسناد ہوا۔ غالباً بانیٔ مرحوم نے بھی اسی جلسہ میں سند حاصل کی[1]۔ عموماً سالانہ جلسوں میں اکابر کے مواعظ طلبہ کی ذہن سازی اور مستقبل کی تعمیری سرگرمیوں میں نہایت مؤثر ثابت ہوتے ہیں، اس جلسۂ تقسیمِ اسناد میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے اصلاحِ مدارس کی بابت چند تجاویز پیش کیں، ان کو غور سے پڑھیے اور بانیٔ مرحوم کی کارکردگی کا مطالعہ کیجیے، ان ہی تجاویز پر عمل پیرا ہو کر آپ نے جامعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ مفتی صاحبؒ کی تجاویز یہ تھیں:

---

[1] مدرسہ امینیہ سے حاصل کردہ بانیٔ مرحوم کی بابرکت سند اب تک ان کے خاندان کے افراد کے پاس موجود ہے، ہم نے اس کو حاصل کرنے کی کوشش بھی کی؛ لیکن نہ مل سکی، اگر وہ مل جاتی تو امید تھی کہ تاریخ کے کچھ اور دریچے وا ہو جاتے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا.

☆ ''جو شخص کسی اسلامی مدرسہ کا مہتمم بنے اسے چاہیے کہ وہ اپنی پوری توجہ اور تمام اوقات مدرسہ کے انتظام میں صرف کرے، مدرسہ کے کاموں کے علاوہ اور کام اپنے ذمہ نہ لے؛ بلکہ اپنی تمام زندگی اس کے کاموں کے لیے صرف کرے، کیونکہ کوئی شخص پوری توجہ کے ساتھ دو کام نہیں کرسکتا۔

☆ مہتممین اور مدرسین کو چاہیے کہ وہ خدا کے ان مہمانوں کے ساتھ نہایت خیر خواہی اور نرمی کا سلوک کرے، ان کی مشکلات کو دور کرے اور ان کے اندر تعلیم کا ذوق وشوق پیدا کرے۔

☆ طلبہ کے داخلے کے وقت نہایت احتیاط سے کام لیا جاوے، صرف ان ہی طلبہ کو داخل کیا جاوے جو دینی علوم حاصل کرنے کا ذوق وشوق رکھتے ہوں، نیز انہیں داخل کرنے سے پیشتر سابقہ مدرسہ کی طرف سے ان کی نیک چلنی کا سرٹیفکٹ حاصل کیا جائے۔

☆ طلبہ میں عزتِ نفس برقرار رکھنے کے لیے انہیں مدرسہ سے باہر کسی دعوت میں نہ بھیجا جاوے، اگر اہلِ خیر طلبہ کی دعوت کرنا چاہیں تو ایک دن قبل مہتمم صاحب کو اطلاع دیں اور وقتِ مقررہ پر کھانا لاکر مدرسہ کے اندر ہی اپنے آدمیوں کے انتظام میں طلبہ کو کھلائیں''۔ (بیس بڑے مسلمان: ۴۲۲، ۴۲۳)

ان تجاویز پر غور کیجیے اور جامعہ کا نظام بھی ملاحظہ فرمائیے، ساری باتیں یہاں پر جاری نظر آئیں گی، جس سے ایک طرف یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بانیٔ

جامعہ اس جلسہ میں موجود تھے تو دوسری طرف یہ بھی آشکارا ہوتا ہے کہ اپنے استاذ کی بات کو کس قدر اہتمام سے اپنے مدرسہ میں جاری فرمایا۔ جب استاذ کی اطاعت کا یہ عالم تھا تو اندازہ لگائیے کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت وفرماں برداری اور پیروی کا کیا عالم ہوگا جس کی نشر واشاعت کی خاطر آپ نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔

جس وقت خلافتِ ترکی اپنی جاں کنی کے عالم میں تھی اور مسلمانانِ عالم اس کو بچانے کے لیے کوشاں تھے، بانیٔ مرحوم نے بھی اس کی اہمیت لوگوں کے سامنے بیان کر کے ایک رقم چندہ کر کے روانہ فرمائی تھی، جس کا تفصیلی ذکر ''سیاسی خدمات'' کے تحت آرہا ہے۔

یہ جذبہ بھی آپ کو اپنے محبوب استاذ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ سے ملا تھا۔ ایسے نازک اور اہم وقت میں حضرت مفتی صاحب کی طرف سے دو اہم فتوے شائع کیے گئے، جن میں سے ایک فتویٰ یہ تھا کہ ''ایسے موقع پر جب کہ ترکی کے مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں، مساجد میں خدا کی بارگاہ میں ان کے لیے دعائیں مانگی جائیں اور قنوتِ نازلہ پڑھی جائے؛ تاکہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے یہ مصیبت دور کرے۔'' اور دوسرا فتویٰ چرمِ قربانی کے بارے میں ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا گیا، نیز آپ نے بھی اس کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ (مستفاد از بیس بڑے مسلمان: ۴۲۲ تا ۴۲۶ ومختصر تاریخ مدرسہ امینیہ: ۴۱)

ان واقعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے اپنی طالبِ علمی کی مدت کس سوزِ دروں سے گذاری! اور استاذ کی اطاعت، قوم وملّت کی خدمت کا جذبہ اور امّت کی بے دینی کا درد کیسے آپ کی رگ رگ میں رچا بسا تھا! جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اتنا عظیم کارنامہ آپ سے صادر فرمایا۔ غرض اسی مدرسہ امینیہ سے وقت کے مقتدر علما کے دستخط سے مزین سندِ فراغت حاصل کر کے اپنے وطن لوٹ آئے اور عزم وہمت کا یہ پیکر علم وعمل، اخلاص وللّٰہیت، اور امت کے درد وفکر کے اوزار وہتھیار سے لیس بے دینی وجہالت سے دو دو ہاتھ کرنے کو میدانِ عمل میں کود پڑا۔ اس وقت آپؒ کی عمر تقریباً چھبیس سال رہی ہوگی۔

طالب علمی کے دورِ سعید میں کیا کیا مشقتیں اور پریشانیاں آپ کو پیش آئیں! جزئی واقعات پیش کرنے سے قلم عاجز وقاصر ہے؛ البتہ آپ کے ایک معاصر حضرت مولانا فضلی مشہدیؒ کی تاریخی شہادت اس سلسلے میں کافی ہے، فرماتے ہیں:

کتنی تکلیفیں اٹھائیں جستجوئے علم میں
منزلیں تحصیل کی؛ بے شک ہیں ایسی ہی کٹھن

بیعت وسلوک

بانیٔ مرحوم کی خدماتِ جلیلہ اور عنداللہ ان کی مقبولیت کو دیکھ کر اس بات میں شک نہیں رہتا کہ آپ کا باطن انتہائی مزکّیٰ اور مجلّیٰ تھا۔ آپ کی کسرِ نفسی جہاں ایک طرف تواضع اور سادگی کا پتہ دیتی ہے وہیں دوسری طرف اخلاص وللّٰہیت کا

درس بھی دیتی ہے، ظاہر ہے کہ خود اپنے ہاتھوں باطن کو مزکّٰی و مصفّٰی بنالینا اتنا آسان نہیں، آدمی خود اس راہ پر چلے تو عموماً بڑا طویل زمانہ درکار ہوتا ہے، اس کے برخلاف کسی متبعِ سنت شیخِ کامل کی صحبت وتوجہ اس راستے کو بہت ہی مختصر بنادیتی ہے۔ ادھر ہم بانیٔ مرحوم کی مدتِ عمر کو دیکھتے ہیں تو اکتالیس سال سے زیادہ نہیں ملتی، اس سے قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بھی کسی شیخِ طریقت کے دامن سے اپنے آپ کو وابستہ کیا ہوگا۔

اب وہ شیخِ طریقت بزرگ کون ہیں؟ اس سلسلے میں نقل کا دامن خالی نظر آتا ہے؛ مگر نظر وعقل کی راہ اپنانے سے ہمیں اس کا سراغ کچھ اس طرح ملتا ہے کہ آپ کے زمانے میں قریبی بستی لاجپور میں اپنے وقت کے بڑے شیخ صوفی شاہ سلیمان لاجپوریؒ حیات تھے؛ بلکہ آپ کی وفات کے وقت بھی صوفی صاحب مسندِ ارشاد پر براجمان تھے، نیز مدرسہ تعلیم الدین کے ابتدائی مدرسین میں ایک نام مولوی صوفی محمد لاجپوریؒ کا بھی ملتا ہے جو صوفی صاحب کے بڑے فرزند ہیں اور آپ کے جانشین بھی رہے ہیں، مزید برآں آپ کے وہ استاذ جن کے دستِ بابرکت سے آپؒ نے اپنے مدرسے کی بنیاد رکھوائی یعنی مولانا احمد میاں لاجپوریؒ وہ بھی صوفی صاحب کے فرزند تھے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ بانیٔ مرحوم، شاہ صوفی سلیمان صاحبؒ سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح ایک احتمال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپؒ حضرت صوفی صاحبؒ سے بیعت ہوئے①۔

① یہاں ایک سوال ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ جب آپؒ صوفی صاحب سے بیعت وارادت کا

دوسری طرف آپ نے جن اداروں سے تعلیم حاصل کی ہے ان میں ایک نام جامع العلوم کانپور ہے، اس کی بنیاد خود حضرت تھانویؒ کی ذاتِ اقدس کی رہینِ منت ہے، بانیٔ مرحوم نے دوسال اس مدرسے میں تعلیم حاصل کی، اگر چہ ۱۳۱۵ھ میں حضرت تھانویؒ کانپور سے تھانہ بھون منتقل ہو چکے تھے اور بانیٔ مرحوم ۱۳۲۰ھ میں کانپور پہنچے؛ اس لیے حضرت تھانویؒ سے درسی استفادے کا موقع تو نہ مل سکا؛ تاہم مدرسے کے احوال، انوارات اور اساتذہ کو دیکھ کر ممکن ہے کہ حضرت تھانوی کی طرف رجوع کا رجحان پیدا ہوا ہو اور مدرسہ امینیہ سے فراغت کے بعد حضرت تھانویؒ کی طرف رجوع کیا ہو؛ اس لیے کہ اس وقت تھانہ بھون کا یہ امدادی دربار اپنے شباب پر تھا۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ آپ نے اس زمانے کے عام دستور کے مطابق

➲ تعلق رکھتے تھے تو پھر ان ہی کے دستِ مبارک سے مدرسے کا سنگِ بنیاد کیوں نہیں رکھوایا؟۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مدرسے کا قیام ایک علمی کام تھا اور تعلیم میں آپ کا تعلق اپنے استاذِ محترم مولانا صوفی احمد میاںؒ سے تھا، سب سے زیادہ کتابیں آپ ہی سے پڑھنے کی سعادت میسر آئی تھی؛ اس لیے سنگِ بنیاد کے سلسلے میں استاذِ محترم کی طرف رجحان فطری ہے۔ نیز ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد صوفی صاحب ہجرت کر کے سورت تشریف لے جا چکے تھے اور وہاں مستقل سکونت اختیار فرما کر خلق کی فیض رسانی میں مشغول تھے؛ اس لیے ان کو زحمت دینا گوارا نہ کیا ہو، یا یہ بھی ممکن ہے کہ صوفی صاحب زمانۂ تاسیس میں کہیں سفر پر ہو اور ان کی غیر موجودگی میں صاحبزادے سے بنیاد رکھوائی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ صوفی سلیمان صاحب خود ایک مدرسے کے بانی و مہتمم رہے ہیں؛ لیکن غدر کے بعد مدرسہ تعطل کا شکار ہو گیا، بعد ازاں آپ سورت منتقل ہوئے تو آپ پر ذکر و اشغال اور تصوف و خانقاہ کا غلبہ ہو گیا، شاید یہی وجہ ہے کہ تاسیس کے لیے بانیٔ جامعہ کا ذہن ان کی طرف منتقل نہ ہوا ہو۔ واللہ اعلم

گنگوہ حاضر ہوکر حضرت گنگوہی سے استفادہ کیا ہو؛ اس لیے کہ آپ کی فراغت کے سال ۱۳۲۲ھ میں امامِ ربّانی حضرت گنگوہی کا آستانۂ مبارک موجود تھا، حضرت گنگوہی کی وفات ۸ یا ۹/ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ میں ہوئی ہے، اس اعتبار سے بانیٔ مرحوم کو گنگوہی دربار کے آخری دور سے استفادے کا موقع ملا ہوگا۔

اور اگر آپ کسی سے بیعت نہ بھی ہوتب بھی اُس زمانے کی تعلیم وتربیت کا انداز اور اساتذہ کی محنتیں ہی ایسی تھیں کہ فارغ ہوتے ہوتے آدھا سلوک طے ہوجاتا تھا؛ بلکہ محنت وشوق اور مجاہدہ وریاضت کی زیادتی پورا سلوک بھی طے کروا دیتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اُس زمانہ کے فضلا کو اپنے بڑوں کی طرف سے بیعت ہوتے ہی خلافت سے نواز دیا جاتا تھا۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف سے حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیملپوریؒ کو بیعت کی التماس پر ہی خلافت مِل جانے کا واقعہ بارہا اپنے اساتذہ سے سنا ہے۔

اور ان سب سے ہٹ کر یہ بھی تو ممکن ہے کہ بانیٔ مرحوم ان خاصانِ خدا میں سے ہوں جن کی تربیت کا انتظام اللہ تعالی اپنے خزانۂ غیب سے خود فرماتے ہیں اور بلا کسی کڑی محنت ومجاہدے کے ان کو اپنا قربِ خاص عطا فرماتے ہیں۔ بہر حال احتمالات کئی ایک ہیں، بانیٔ مرحوم کے احوال دیکھ کر خود فیصلہ فرمالیجیے کہ کونسی صورت پیش آئی ہوگی۔ خدا کرے کہ اس سلسلے میں کوئی نص ہاتھ آجائے اور ہمارے سامنے بھی کوئی روشن باب کھل جائے۔

بانیٔ مرحوم کی خدمات

علمی خدمات

فراغت کے بعد خدمتِ دین کے جذبے کو ڈھن کی تسکین اور تکمیلِ عزائم کے جذبات لیے اپنے وطن گجرات لوٹے اور سورت شہر میں تراوا سیٹھ کے مدرسہ (جو مدرسہ تراوا سے مشہور تھا) میں ''مدرسِ اول'' مقرر ہوئے۔

(ذکرِ صالحین: ۳۹۹)

یہ تراوا پاڑیہ سیٹھ کا مدرسہ کہاں تھا اور کیسا تھا؟ اس سلسلے میں معلومات نہ مل سکی، شاید آج کل جہاں ''تراوا مسجد'' سورت ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع ہے وہیں یہ مدرسہ چلتا ہو

گا۔ نیز مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ، مولانا عبدالحی کفلیتویؒ کے متعلق خبر دیتے ہیں کہ: حضرت مولانا عبدالحی کفلیتویؒ نے سیٹھ حاجی اسماعیل پیپڑی کے مدرسہ اسلامیہ محمدیہ راندیر میں منصبِ تدریس کو زینت بخشی۔ (ذکر صالحین ۲/۳۸۱)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ: اس زمانے میں سیٹھ لوگ اپنے اپنے خرچ پر مدرسے چلاتے تھے، جس سے علاقے میں علم کی روشنی پھیلتی تھی، اس قسم کے مدرسے سورت شہر واطراف میں اس وقت موجود تھے، یہ مدرسہ بھی اسی قسم کا رہا ہوگا جس میں بانیٔ مرحوم نے ''صدارت تدریس'' کے فرائض انجام دیے۔

قیامِ جامعہ کی خشتِ اول

چوں کہ آپ کے دل میں اپنے وطن سملک وڈابھیل کی بدعات وخرافات کا درد بھرا ہوا تھا؛ لہٰذا اس ملازمت کو خیر باد کہہ کر وطن میں فروکش ہوئے اور اپنے گھر میں دینی تعلیم کا سلسلہ شروع فرمایا، گویا اس شجرۂ طیبہ کا بیج بونے کے لیے اپنے ہی مکان کا انتخاب فرمایا۔

حضرت مولانا تجمّل حسین فضلی مشہدیؒ فرماتے ہیں:

اپنی بستی کے لیے کی وقف ساری عمر
آپ حاصل کر چکے جس وقت کہ ہر علم وفن
از پئے تعلیمِ دیں تھے بانیٔ دارالعلوم
موضع ڈابھیل سملک میں، جو تھا خود کا وطن

اندازہ لگائیے: علومِ اسلامیہ کی نشر واشاعت اور تعلیماتِ شرعیہ کی تعلیم و تعلّم کا کیسا جذبہ آپ کے دل میں موجزن ہوگا کہ خدمتِ دین کی خاطر کسی جگہ سے ملازمت کی پیشکش میں بیٹھے نہ رہے۔ سچی تڑپ آدمی کو راستے خود ہی سجھا دیتی ہے اور اہلِ عزیمت اپنی منزل کے لیے راستے خود تلاش ہی نہیں کرتے؛ بلکہ تعمیر بھی کر لیتے ہیں۔

خلوص وللّٰہیت کا اثر لابدی تھا، طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی تو یہ سلسلہ سملک کی مسجد میں حوض کے تخت پر جاری فرمایا، اسی بابرکت جگہ پر تحریکِ ریشمی رومال کے

موقع سے حضرت شیخ الہندؒ نے لوگوں کو بیعت کیا تھا۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۳، ۱۱۶)

اور بہ قول حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم العالیہ: شیخ الہندؒ اس وقت حضرت مولانا احمد بزرگؒ کے مکان میں ٹھہرے تھے۔

شاید کوئی آ نکلے خوشبو کی تمنا میں	صحرائے محبت میں کچھ پھول کھلا جاؤں

چناں چہ حضرت مولانا احمد بزرگؒ اپنی ایک روئداد میں جامعہ یا دارالعلوم کی ضرورت بیان کرتے ہوئے رقم فرماہیں: ظاہر ہے کہ کسی جامعہ کا قیام کوئی معمولی کام نہیں، اس کے لیے اگر ایک طرف بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی تو دوسری طرف ایک ایسی شخصیت بھی درکار تھی جو متدین، سنجیدہ، خوش اخلاق، مستقل مزاج، اولوالعزم، بلند ہمت، وسیع القلب اور صاحبِ علم وفضل ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پیمانہ پر انتظامی قوت بھی رکھتی ہو، اگر چہ بظاہر جہل آباد گجرات میں ایسی جامع ہستی کا وجود عنقا تھا؛ مگر حکمتِ ایزدی کا فیصلہ بہت جلد ظہور میں آیا، اہلِ گجرات کی قسمت چمکی اور ان کی ٹوٹی ہوئی کشتی کا ناخدا، خدائے تعالیٰ نے جناب مولانا احمد حسن بھام سملکی مرحوم بانیٔ مدرسہ کو منتخب کیا۔

اور پھر مرحوم نے توکلاً علی اللہ چند محبین ومخلصین کی اعانت سے سملک کی مسجد میں ماہِ شعبان المعظّم ۱۳۲۶ھ کو جامعہ کا افتتاح ''مدرسہ تعلیم الدین'' کے نام سے ایک بڑے مجمع میں اپنے استاذ مولانا صوفی احمد میاں لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے کرایا۔ (روئداد جامعہ، ۱۳۵۰ھ بحوالہ تاریخِ جامعہ ڈابھیل: ۳۶، ۳۸)

کیا ہی خوب اتفاق ہے کہ دارالعلوم دیوبند جب شروع ہوا تو ابتدا میں دو محمود استاذ شاگرد تھے، ایک ملا محمود دیوبندیؒ: استاذ اور دوسرے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ: شاگرد تھے اور یہاں بنا رکھی جاری رہی ہے دو احمد نامی بزرگوں کے ہاتھوں اور یہ دونوں بھی استاذ شاگردی کا رشتہ رکھتے ہیں، نیز محمود اور احمد دونوں کا مادّۂ اشتقاق بھی متحد ہے، شاید اسی غیر اختیاری دیوبندی نسبت نے چھوٹے سے مدرسہ کو جامعہ بنا کر دیوبند ہی کی شاہراہ پر لا کر کھڑا کیا ہوگا۔ بہر حال بانیٔ مرحوم نے باقاعدہ مدرسہ کا افتتاح فرما کر ایک شمع روشن کی، اس میں جذبۂ للّٰہیت اور جوشِ عمل کا روغن بھرا، پھر دنیا نے دیکھا کہ یہی شمع اور چنگاری بھڑک بھڑک کر شعلۂ جوالہ؛ بلکہ آفتابِ عالم تاب بن گئی۔ (تعارفِ جامعہ: ۷)

غور کیجیے کہ یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دینے والا کوئی سن رسیدہ، سفید ریش بزرگ نہ تھا؛ بلکہ ایک اکتیس سالہ ابھرتا جوان تھا، جس نے بالکل کھلتی جوانی میں جامعہ کی بنیاد رکھی اور اس پر یہ اخلاص! بڑے بڑے مشائخ کی خدمت و صحبت میں طویل طویل عرصہ رہنے کے بعد جو خلوص انسان حاصل کر سکتا ہے وہ اکتیس سال کے اس خوبرو نوجوان کو حاصل تھا، جس کے اخلاص کا عظیم تاج محل جامعہ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور حیرت ہے کہ اکتالیس سال کی عمر میں تو وفات بھی ہوگئی، اتنی کم عمری میں کیسے عظیم الشان کام کر گئے! وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے اخلاص کے ساتھ زندگی کی ایک ایک گھڑی کی قدر کی، اتنی عمر میں

ایسا زبردست کارنامہ یقیناً عجوبۂ روزگار ہستیوں سے ہی صادر ہوسکتا ہے۔

(بانیٔ جامعہ نمبر:۶۶)

بات دراصل یہ تھی کہ روز اول سے ہی یہ طے ہو چکا تھا کہ بانیٔ مرحوم کے ہاتھوں یہ کارنامہ صادر ہونا ہے، جس کی بشارت حضرت مولانا احمد صاحب بزرگؒ کو خواب کے ذریعے دی گئی تھی۔

حضرت مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ کا بیان ہے: یہ خواب مجھے مولوی عبدالحق میاں صاحب سملکیؒ نے سنایا کہ: مولانا احمد بزرگؒ نے (جن دنوں دارالعلوم کے سمندر میں تلاطم برپا تھا اور امت کی مایۂ ناز ہستیاں دارالعلوم کی خدمات سے دست بردار ہو چکی تھیں۔) ان ہی دنوں میں نے ایک خواب دیکھا۔ خود فرماتے ہیں کہ: سملک میں چوراہے پر ایک بڑ کے درخت (اب یہ درخت نہیں ہے) کے زیر سایہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسدِ اطہر محوِ خواب ہے، اور حضرت مولانا احمد حسن صاحب مرحوم بانیٔ مدرسہ جامعہ اسلامیہ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسدِ اطہر کے پاس کھڑے ہیں، میں مسجد جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کر شاہراہِ عام پر پہنچا تو مولانا احمد حسن صاحب نے مجھے آواز دی کہ: مولوی احمد! یہاں آؤ، میں پاس پہنچا تو مولوی صاحب نے فرمایا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسدِ مبارک کو پہنچانے میں میری مدد کرو، چناں چہ ہم دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اقدس کو اٹھا کر مولوی احمد حسن صاحب کے گھر میں ایک بستر پر لٹا دیا، اس کے بعد میری آنکھ کھل

گئی۔ (ذکر صالحین ۲/ ۴۲۷)

خود مولانا بزرگؒ اس کی تعبیر میں فرمایا کرتے تھے: مولانا احمد حسن صاحب کے معنوی مکان (مدرسہ) میں میری اعانت سے علومِ نبویہ کے حاملین بلائے گئے۔ (ذکر صالحین ۲/ ۴۲۹)

یہ اشارہ تھا دیوبند سے تشریف لانے والے اساطینِ علم وفضل کے بابرکت کارواں کی طرف۔

مدرسہ کی تعلیمی کیفیت

قرآن مجید اور فارسی وعربی کی ابتدائی تدریس سملک کی مسجد میں ہونے لگی اور نونہالانِ امت اس سے فیض حاصل کر کے خود کو خادمِ دینِ اسلام اور محافظِ قوم وملت بنانے میں مصروف ہوئے، ایک ہی سال میں وہ ترقی ہوئی کہ سالانہ امتحان میں ممتحن حضرات بھی اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ- جو بانیٔ مرحوم کے ہم درس رہ چکے ہیں- اپنے معاینہ میں رقم طراز ہیں:

”مدرسہ تعلیم الدین واقع ڈابھیل، سملک کا سالانہ امتحان مورخہ ۲۱، ۲۲/ شعبان ۱۳۲۷ھ بروز سہ شنبہ وچہار شنبہ کو لیا گیا، گو مدرسہ میں میری حاضری ایسے وقت ہوئی کہ طلبا عربی، فارسی واردو کے امتحان سے فارغ ہو چکے تھے،؛ بلکہ مجھے طبعی رنج ہے کہ میں ان طلبا کی اس لیاقت کو جوان سے بروقتِ امتحان ظہور میں

آئی نہ دیکھ سکا، تاہم میرے ان دوستوں سے جو مدرسہ کے ممتحن تجویز کیے گئے تھے، جو حالات میں نے طلبا کے سنے، اس سے مجھے نہایت مسرت ہوئی کہ اردو، فارسی وعربی کے کمسن لڑکوں نے اس خوبی سے برسرِ مجلس برجستہ الفاظ میں نہایت آسانی سے کتابی سوالات کے جوابات دیے کہ اہلِ مجلس خوش ہوجایا کرتے تھے، گجراتی وانگریزی کا امتحان میری موجودگی میں طلبا نے نہایت عمدہ طور پر دیا، انگریزی مشکل مشکل لغات کے ترجمے طلبا نہایت آسانی سے بتلادیا کرتے تھے، اس کیفیت نے میرے قلب پر نہایت گہرا اثر کیا، بلا ریا یہ میری ذاتی رائے ہے کہ مدرسینِ مدرسہ نے نہایت جانکاہی وتندہی سے اپنے گرامی اوقات طلبا کی علمی و ادبی لیاقت بڑھانے میں صرف کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ معلمین کی سعی کو مشکوریت کا جامہ پہنائے''۔ (رجسٹر معاینہ بحوالہ نقوشِ بزرگاں: ۱/ ۶۷، ۶۸)

یہ خوشگوار تبدیلی اور حیرت انگیز نتائج کیوں نہ حاصل ہوتے؟ اس لیے کہ بانیٔ مرحوم کی خداداد انتظامی صلاحیتیں اس کے پیچھے مسلسل خرچ ہورہی تھیں۔ اس کی کچھ جھلکیوں کا مشاہدہ کیجیے:

تجوید کا انتظام:

تاریخِ جامعہ میں لکھا ہے کہ ''مولانا مرحوم کی خواہش تھی کہ قرآن مجید کی تعلیم باقاعدہ تجوید کے ساتھ ہونی چاہیے؛ کیونکہ یہ کلامِ بلاغت نظام جس درجہ رفیع المرتبت ہے اسی قدر اس کو صحیح حاصل کرنے کی بھی ضرورت ہے، آپ نے اس

ضرورت کے لیے درجۂ تجوید قائم کیا اور ایک ماہر قاری (حافظ محمد شریف خان ٹونکیؒ) کا تقرر کیا، یہ اسی کی برکت ہے کہ آج قرآن شریف کے صحیح پڑھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ان اطراف میں موجود ہے۔

آگے چل کر بانیٔ مرحوم کی اسی جاں فشانی و دل سوزی کا ثمرہ ''لجنۃ القرا'' کی شکل میں ظاہر ہوا، جس کا وجود اگرچہ بانیٔ مرحوم کی حیات میں نہ ہوسکا؛ لیکن بعد میں آپ ہی کا قائم کردہ نظامِ تجوید مستقل ایک متحرک وفعال انجمن کی شکل اختیار کر گیا جس کے فیض سے ایک عالم مستفیض ہو رہا ہے۔

خوش نویسی:

تعلیم کے ساتھ صنعتِ کتابت کی بھی ضرورت محتاجِ بیان نہیں، مولانا مرحوم کو اس کا بھی بہت خیال تھا، آپ کی نظر سے ایسے طلبہ کا حال مخفی نہیں تھا کہ دستارِ فضیلت حاصل کر لینے کے باوجود ان کا املا صحیح نہیں ہوتا تھا؛ حسنِ خط در کنار رہا؛ اس لیے آپ نے ابتدا ہی سے طلبہ پر املا نویسی اور خوش نویسی کی مشق لازم کر دی تھی اور اس کو فن کی حیثیت سے باقاعدہ سکھلانے کے لیے ایک تجربہ کار خوش نویس منشی کانپور سے بلایا۔

طریقۂ تعلیم:

مولانا مرحوم نے ابتدائی تعلیم کی اہمیت کو محسوس فرمایا کہ اس کی پختگی اور مضبوطی کے بغیر آئندہ کامیابی اور ترقی نہیں ہوسکتی؛ اس لیے ابتدائی تعلیم کی نگرانی

کی طرف بے حد توجہ کی، سالانہ، ششماہی اور سہ ماہی امتحانات کے علاوہ ماہانہ امتحان بھی تجویز فرمایا اور اکثر خود بنفسِ نفیس یہ امتحان لیتے تھے۔

اردو زبان:

یہاں کی مادری زبان عموماً گجراتی ہے؛ مگر دینی مدارس میں تعلیم وتعلُّم کا سلسلہ ہمیشہ اردو زبان کے ذریعہ قائم رہا ہے، بچے اس طرزِ تعلیم سے اسی وقت پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب کہ وہ اردو زبان بولنے اور سمجھنے پر قادر ہوں؛ اس لیے مولانا مرحوم نے ہر ایک طالبِ علم پر اردو میں بات کرنا لازم کر دیا تھا، اگر کسی کو گجراتی میں بات کرتے سن لیتے تو سخت ناراض ہوتے تھے، بعض اوقات سزا تک دیتے تھے، اس طرح چھوٹے بچوں میں بھی اردو بولنے کا شوق پیدا ہو چلا تھا''۔

(رودادِ جامعہ اردو، ۱۳۵۰ھ ص: ۱ تا ۵ بحوالہ تاریخِ جامعہ: ۳۹، ۴۰)

یہ تھی بانیٔ مرحوم کی فراست اور ان کا حسنِ انتظام کہ ایک چھوٹے سے مدرسہ میں یہ سارے انتظامات فرما کر علم وعمل سے آراستگی کے ممکنہ اسباب جمع فرما دیے، اسی کا نتیجہ تھا کہ تاسیسِ مدرسہ کے بعد بفضلہٖ تعالی بہت جلد مدرسے کی ترقی ہونے لگی، طلبہ کی کثرت کے ساتھ مدرسین وملازمین میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور باقاعدہ عربی، فارسی، اردو، قرآن شریف اور گجراتی کی تعلیم ہونے لگی۔ (تاریخِ جامعہ: ۳۹)

عصری تعلیم:

بانیٔ مرحوم نے مدرسہ میں دین کی تعلیم کے ساتھ دنیا کی تعلیم کا سلسلہ بھی

جاری کیا تھا، اس وقت چھ تک اسکول پڑھنے سے سرکاری نوکری مل جاتی تھی، آپؒ نے مدرسے میں باقاعدہ اسکول کی کلاسیں جاری کی تھیں۔ خود مولانا نے ایک موقع سے لکھا ہے: ہمارے مدرسے کی تعلیم کا یہ حال ہوگیا ہے کہ یہاں کا فارغ یعنی دنیوی تعلیم حاصل کردہ شخص کسی سرکاری عہدے کے لیے درخواست دیتا ہے تو اس کی درخواست قبول کی جاتی ہے۔ اس زمانے میں جہاں لڑکے مدرسے میں پڑھتے تھے وہیں سملک ڈابھیل کی چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی پڑھتی تھیں، غرض یہ کہ دینی اور دنیوی تعلیم دونوں کا نظم تھا، سادہ الفاظ میں خلاصہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ: مولانا بھامؒ نے ڈابھیل وسملک کے گھر گھر میں دینی اور دنیوی تعلیم پہنچائی تھی۔

(بانیٔ جامعہ نمبر:۱۰۹)

اب مدرسہ کی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے آپ نے کیا قدم اٹھایا؟ اس کا مشاہدہ کیجیے:

مدرسہ کی معاشی حالت

چاول آٹے کی برکتی مٹھی:

مدرسہ کے اخراجات کے لیے بانیٔ مرحوم کی بصیرت اور دوراندیشی نے جو راستہ اختیار کیا یہ بھی آپ ہی کا حصہ تھا، حضرت مولانا محمد سعید صاحب بزرگؒ رقم طراز ہیں: ''خدا کے ایک برگزیدہ اور مسلمانوں کی دینی جہالت ورسوم پرستی سے دردمند حضرت مولانا احمد حسن بھامؒ نے بڑی بے سروسامانی کے عالم میں اس کو شروع کیا،

گاؤں کے ہر گھر میں ایک ایک ہنڈیا رکھ دی گئی کہ عورتیں جب اپنے گھر کی روٹی پکانے کے لیے بیٹھیں تو ایک مٹھی آٹا اس ہنڈیا میں بھی ڈال دیا کریں، یہ تھا وہ چندہ جس سے تعلیم الدین کی ابتدا ہوئی۔ (تاریخِ جامعہ:۲۱۰)

اسی حقیقت کو خود بانیٔ مرحومؒ قوم سے خطاب کرتے ہوئے یوں عیاں فرماتے ہیں: ''اپنے مدرسہ کی بنیاد ۱۳۲۶ھ میں اس حالت میں ہوئی کہ اس وقت مجھ خادم احمد حسن اور ایک قرآن شریف کے مدرس (مولانا احمد درویش سملکیؒ رفیقِ درس بانیٔ مرحوم) کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا، نیز مالی امداد کے لیے اس غریب بستی کے چاول آٹے کی برکتی مٹھی کے سوا کوئی دوسری صورت نہ تھی''۔ (تاریخ جامعہ:۳۹)

پھر اس آٹے اور چاول کو وصول کرنے کے لیے بھی آپ خود بنفسِ نفیس گھر گھر تشریف لے جاتے، ایک کندھے پر ایک تھیلا لٹکا ہوتا، جو آٹے کے لیے ہوتا اور دوسرے کندھے پر دوسرا تھیلا ہوتا جس میں چاول جمع فرماتے اور خود لا کر مدرسہ کے گودام میں جمع فرماتے۔ آج یہی ننّھا سا پودا ہنڈیا اور مٹکوں کی شکل سے متجاوز ہو کر کھیت وکھلیان کی شکل اختیار کر چکا ہے، جو ''غلہ اسکیم'' کے نام سے آج بھی طلبۂ جامعہ کی غذائی حوائج پوری کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

حضرت مفتی عباس صاحب بسم اللہ دامت برکاتہم اپنی دادی اماں کے حوالے سے اس کی مزید تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: دادی اماں کہتی تھیں: میں نے وہ دور بھی دیکھا ہے کہ مولانا نے ڈابھیل سملک کے ہر گھر میں دو مٹکے

رکھوائے تھے، یہ مٹکے کچھولی کے ایک کمہار نے تیار کیے تھے، مولانا نے یہ تاکید کی تھی کہ جب دوپہر کو کھچڑی بناؤ تو ایک مٹھی چاول اس مٹکے میں ڈال دینا اور شام کو جب جوار کی روٹی بناؤ تو ایک مٹھی آٹا اس میں ڈال دینا، مولانا نے دن متعین کیے تھے، کبھی اس محلہ میں اور کبھی دوسرے محلہ میں خادم کے ساتھ آتے، کپڑے کی جھولی بنائی تھی، اس میں وہ مٹکا انڈیل دیا جاتا، ایک میں چاول ڈال دیتے، دوسری جھولی میں آٹا ڈال دیتے، مولانا بذاتِ خود اپنی پشت پر اٹھا کر مدرسے میں پہنچاتے تھے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۷۷)

ہیں مردِ مجاہد کے بھی انداز نرالے		رفتار قیامت کی ہے اور پاؤں میں چھالے

مدرسہ کے چندے کے لیے پتھر کھانا:

مدرسے کے چندے کی خاطر آپ نے کس قدر مشقت اٹھائی درجِ ذیل واقعے سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

حضرت مفتی عباس صاحب بسم اللہ دامت برکاتہم جامعہ کے ایک خادم (عبدالرحمن کاکا بسم اللہ) کے بڑے بھائی: ابراہیم کاکا کے حوالے سے نقل کرتے ہیں: ایک مرتبہ مولانا احمد حسن بھامؒ چندہ کرنے نکلے تو بستی کے ایک آدمی نے پتھر مارے، مولانا نے کچھ نہیں کہا، دامن سمیٹ لیا اور جتنے پتھر مارے تھے تمام پتھروں کو اپنے دامن میں اکٹھا کرلیا، ایک آدمی نے پتھر مارنے والے کو ڈانٹا: انھوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے کہ تو ان کو پتھر مارتا ہے؟ یہ تو بہت بڑے عالم

ہیں! اور پھر مولانا سے پوچھا کہ یہ پتھر آپ نے کیوں اٹھائے؟ فرمایا: مدرسے کی ایک عمارت بنانے والا ہوں، سنگِ بنیاد میں ان پتھروں کو ڈالوں گا، یہ مجھے چندے میں ملے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: میں نے ان (ابراہیم کا کا بھائی) سے پوچھا کہ یہ واقعہ آپ نے کس سے سنا؟ کہنے لگے کہ حافظ قاری عبداللہ میاں کے مرحوم دادا ''حاجی باوا'' سے سنا۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۲۴، ۲۵)

اتنی سفّاک سماعت بھی غضب ہے کہ جہاں
بات پوری بھی نہ ہو، ہاتھوں میں پتھر آجائیں

مدرسہ کے لیے گھر کے زیورات:

بانیٔ دارالعلوم قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم کی ترقی کے خاطر اپنے گھر کے زیورات تک داؤ پر لگا دیے تھے، ہمارے بانیٔ جامعہ بھی آخر ان ہی کا تو عکسِ جمیل تھے، کیسے پیچھے رہتے؟ چناں چہ بانیٔ مرحوم کے پوتے حافظ خلیل بھامؒ کے حوالہ سے ''اجلاسِ صدسالہ'' میں مذکور ہے کہ: ''مولانا بھامؒ نے مدرسہ کی ترقی وضرورت کے خاطر اپنے گھر کے زیورات تک فروخت کر دیے تھے''۔ (اجلاسِ صدسالہ: ۳۶۔ نقوش بزرگاں ۱/ ۶۴)

بانیٔ مرحوم مدرسے کے بانی ومہتمم ہونے کے باوجود خود بنفسِ نفیس اس کے سفیر بھی تھے، اور اطراف واکناف میں چندے کے سلسلے میں خود تشریف لے

جاتے اور مہمانانِ رسول کی کفالت کا فرض انجام دیتے۔ فخرِ گجرات حضرت مولانا علی محمد ترا جویؒ اپنی کٹھور کی زمانۂ طالبِ علمی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: رمضان المبارک میں مدرسہ تعلیم الدین کے چندے کے سلسلے میں مولانا احمد حسن بھامؒ کی تشریف آوری ہوئی تھی۔۔۔۔الخ (نقوشِ بسم اللہ: ۱/ ۵۱۵)

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ	بجھ تو جاؤں گا مگر صبح کر جاؤں گا

اسی ایثار وقربانی کا نتیجہ تھا کہ کچھ ہی عرصے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جامعہ کو دو مخلص صاحبِ خیر بندے عطا فرمائے: (۱) جناب حاجی موسیٰ میاںؒ (۲) جناب حاجی یوسف گارڈیؒ، جن کے دل میں حضراتِ اکابرینِ دیوبند کو دعوتِ تدریس دینے کی تحریک پیدا ہوئی اور ان دونوں حضرات نے ایک ایک ہزار روپیے ماہانہ مدرسہ کو دینے کا وعدہ فرمایا۔ (تاریخ جامعہ: ۶۱)

بانیٔ مرحوم کی ان ہی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آج بھی جامعہ ہر طرح کی مالی پریشانوں سے محفوظ ہے، اور خدائے جلّ وعلا سے امیدِ قوی ہے کہ بانیٔ جامعہ کی اس قربانی کی برکت سے صبحِ قیامت تک محفوظ رہے گا ان شاء اللہ۔

مدرسہ کی ابتدائی حالت

اسی طرح خلوص وللّٰہیت اور بہترین نظم ونسق کے ساتھ تیزی سے مدرسہ ترقی کرنے لگا، طلبہ کی کثرت کے ساتھ مدرسین وملازمین میں بھی اضافہ ہونے لگا، تاسیسِ مدرسہ کے چند ماہ بعد تین افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی اور قوانینِ

متعلقہ مدرسہ تعلیم الدین کی ۳۷/دفعات باہمی مشورہ سے طے کی گئیں، جن میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کارکنانِ مدرسہ کیسے ہونے چاہییے؟ ۱۲/ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ کو سرزمینِ ڈابھیل میں ایک عالی شان جلسہ ہوا جس کی روئیداد کے چند اقتباسات حسبِ ذیل ہیں:

''موضع سملک ڈابھیل کے مدرسہ تعلیم الدین کی علمی ترقی نے لوگوں کے دلوں میں عجیب خوشی پیدا کردی کہ اب ہر فردِ بشر علمی ضرورت اور اصلاحِ قوم کا احساس کر سکے گا، بس اتنا ہی نہیں؛ بلکہ عملی کارروائی شروع ہوگئی۔ چناں چہ اس مدرسہ کی تحریک سے ۱۲/ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ کو موضع ڈابھیل میں اطراف کے اٹھائیس گاؤں کے لوگوں نے جمع ہوکر ایک عالی شان کانفرنس کا انعقاد کیا، جس میں تمام لوگوں نے پوری خوشی سے اصلاحِ قوم کے متعلق چند مفید قوانین پر اتفاق کرلیا۔۔۔۔الخ۔

یہ جلسہ نہایت شان وشوکت سے رہا، ابتداءً طلبائے مدرسہ کے ایک حافظ صاحب نے قرآن مجید کا ایک رکوع اچھے لہجہ میں سنا کر لوگوں کو محظوظ کیا...الخ۔

اس کے بعد مدرسہ ہذا کے مدرسِ عربی مولوی محمد میاں ① (بن صوفی

---

① مولوی محمد میاں صوفیؒ: حضرت صوفی سلیمانؒ کے بڑے صاحب زادے تھے، آپؒ کی ولادت غالباً ۱۸۴۵ء میں قصبہ لاجپور میں ہوئی۔ آپ عالم اور صالح بزرگ تھے، آپ اپنے والد کے جانشین تھے، آپ نے ابتدائی تعلیم خود اپنے والد بزرگوار صوفی صاحبؒ سے حاصل کی اور لاجپور میں گجراتی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد زیادہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یوپی تشریف لے گئے، جہاں فقہ،

سلیمان) صاحب لاجپوریؒ (م: ۱۳۶۳ھ) نے ایک پُرزور تقریر میں کل ہندوستان خصوصاً صوبۂ گجرات کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت نیز قومی فیاضیوں کا دوسری اقوام کے ساتھ موازنہ کرکے تنزلِ مسلمان وعروجِ دیگر اقوام کا ثبوت دے کر عام مسلمانانِ گجرات کو بڑی عبرت دلائی۔۔۔الخ۔

اس کے بعد مہتمم مدرسہ ہذا مولوی احمد حسن صاحبؒ نے ضلع سورت میں ایک متفق علیہ قومی دارالعلوم کی ضرورت بیان کرکے مدرسہ ہذا میں قرآن مجید، اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور گجراتی کی تعلیم کا سلسلہ ہونے کے سبب لوگوں کو اس مدرسہ تعلیم الدین کو دارالعلوم خیال کرنے کی طرف توجہ دلائی اور ظاہر کیا گیا کہ فی الحال مدرسہ تعلیم الدین میں ایک سوتیس طلبا اطراف وجوانب کے تعلیم پاتے ہیں۔۔۔الخ۔

➲ حدیث، تفسیر وغیرہ فنون میں کتابیں پڑھیں، اوراس میں ترقی حاصل کی۔آپ کی علمی استعداد بہت ہی بلند اور قابلِ تعریف تھی، اوراسی لحاظ سے عالمِ شباب میں مدرسہ جامعہ ڈابھیل میں ایک مدرس کی حیثیت سے آپ کی تقرری ہوئی، جہاں آپ نے تقریباً پانچ سال تک درس دیا اوردین کی خدمت انجام دی۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی استعداد سے سرفراز فرمایا تھا، اسی طرح آپ کی جسمانی ساخت بھی بہت اچھی تھی، آپ ہر روز صبح اپنے دو چھوٹے بچوں کو کندھے پر بٹھا کر پیدل مدرسہ جامعہ ڈابھیل میں پڑھانے کے لیے جاتے، جو لاجپور سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ہے، اور شام کو واپس اسی طرح تشریف لے آتے۔ مدرسہ جامعہ ڈابھیل میں پانچ سال تک درس دینے کے بعد آپ وہاں سے ملازمت چھوڑ کر خود اپنے والد صاحب کی خدمت میں رہے، اور قصبہ لاجپور میں اپنی خدمت شروع کی۔ بروز منگل بہ وقت دن ۱۲/ بجے مؤرخہ ۲۷/ربیع الاول ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۳/ مارچ ۱۹۴۵ء کو صدسالہ عمر میں وفات پائی، لاجپور کے پرانے قبرستان میں مدفون ہوئے۔اللھم اغفرلہ وارحمہ وسکنہ فی الجنۃ. (باغ عارف ص:۱۵، ۱۷)

اس وقت مدرسہ میں ایک مدرسِ عربی اور ایک فارسی باذوق اور ایک ماسٹر انگریزی اور ایک گجراتی اور ایک محرر اور ایک سپاہی اور ایک باورچی ملازم ہیں... الخ۔ (روئیداد جلسۂ تعلیم الدین بحوالہ تعارفِ جامعہ: ۱۶/ ۱۷)

اسی زمانے کی حالت کو حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ اپنے معاینہ میں بھی درج فرماتے ہیں: ''علاوہ ازیں مدرسہ کے دیگر کاروبار کو بھی میں نے غور وتأمل اور طالب علمانہ نظر سے دیکھا، گو مدرسہ کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے بعض امور میں بے انتظامی ظہور میں آئی؛ لیکن اس کی وجہ صرف کمیٔ سرمایہ وعدمِ توجہیٔ معلمین کہی جائے، اور کچھ نہیں''۔ (نقوشِ بزرگاں ۱/ ۶۸)

تبلیغی خدمات

ماہنامہ الدین کا اجرا:

بانیٔ مرحوم نے اپنے افادات کا سلسلہ اپنی ذات تک ہی محدود نہ رکھا، وہ مدرسہ کا نظام جاری کر کے اطمینان کا سانس لینے والوں میں سے نہ تھے، جن بدعات وخرافات سے جنگ کی انھوں نے ٹھان رکھی تھی، وہ اس کی متقاضی بھی نہ تھیں کہ مرحوم درس وتدریس پر اکتفا کرتے، فاسد عقائد میں جھلستی ملّت اور اعمالِ شرکیہ میں ملوّث قوم کو راہِ نجات دکھانے کے لیے آپ نے اسباب ووسائل کی قلت کے زمانے میں آسمان وزمین کے خزانوں کے مالک پروردگارِ عالم پر بھروسہ کر کے ماہانہ رسالہ بنام ''الدین'' گجراتی زبان میں چھاپ کر شائع فرمانا

شروع کیا۔ (مستفاد از تاریخِ جامعہ:۲۹۹)

یہ رسالہ مدرسہ تعلیم الدین کا ترجمان تھا جس میں اساتذۂ تعلیم الدین کے علمی، دینی اور تاریخی مضامین ہوتے تھے، اخیر کا صفحہ کوائفِ مدرسہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ الدین کے سلسلے میں چند مفید معلومات مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب مدظلہ کے حوالے سے پڑھیے:

رسالہ ''الدین'' کی خدماتِ جلیلہ اور اس کے ذریعے فتنوں کا تعاقب:

الدین رسالہ کب سے کب تک نکلا؟ اس کی صحیح تاریخ نہیں ملتی؛ لیکن جتنے رسالے ہمیں ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم اس کی عمر آٹھ دس سال ضرور رہی ہوگی۔

اِس رسالہ میں ''مدرسہ تعلیم الدین'' کے اساتذہ کے مضمون ہوتے، اطراف واکناف کے علما کے مضمون ہوتے، خود مولانا احمد بزرگؒ اور مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ کے کئی مضامین اس میں موجود ہیں؛ خصوصاً قرب وجوار میں کوئی بدعت ہوتی تو اس پر زوردار مضمون لکھتے۔ مثال کے طور پر دو مضمون میری نظر سے گذرے، دونوں الگ الگ رسالے میں ہیں: عنوان ہے ''محرم کے سپاہی اور رمضان کے نمازی''، جس میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ: ہماری بستی میں اور قرب وجوار میں تعزیے ہوتے ہیں، امام حسین کا جھنڈا لے کر لوگ نکلتے ہیں اور ان کے نام فقیر بنتے ہیں، محلہ محلہ پھر کر اُن کے نام کا چندہ حاصل کرتے

ہیں، تعزیے کے اندر امام حسین کی قبر بناتے ہیں، اس پر ناریل پھوڑتے ہیں، یہ سب خرافات ہیں، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح اس پر انھوں نے سخت رد کیا؛ چناں چہ بعد کی تاریخوں میں ملتا ہے کہ یہ تعزیے بند ہو گئے، معلوم ہوا کہ مولانا نے ہی اس پر کاری ضرب لگائی تھی۔

الدین کی نشر واشاعت کا دائرہ:

رسالہ ''الدین'' کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نشر و اشاعت بہت زیادہ تھی، اس زمانے میں افریقہ کے بڑے بڑے شہروں میں کم از کم اس کے سات ایجنٹ تھے جو وہاں سے چندہ وصول کرتے تھے اور یہ رسالہ وہاں جاتا تھا، اسی طرح یہ رسالہ رنگون جاتا تھا، مولانا غلام نبی تارا پوریؒ رنگون میں اس کے ایجنٹ تھے، اسی طرح موریشیس جاتا تھا، کلکتہ جاتا تھا، غرض یہ کہ دُور دراز کے شہروں اور ملکوں میں جاتا تھا، اِس رسالے کی بڑی خدمات ہیں؛ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہمیں اُس کے سب شمارے نہیں ملتے ہیں، اس لیے کہہ نہیں سکتے کہ کتنے سال یہ چلا؛ تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وقیع خدمات ہیں۔

پہلے یہ رسالہ احمد آباد کے ایک پریس سے نکلتا تھا، اس زمانے میں یہاں سے احمد آباد جانا، مضامین پہنچانا اور پھر وہاں سے یہاں لانا وغیرہ بہت مشکل کام تھا، اتنی سہولتیں نہیں تھیں جتنی آج ہیں، بڑی دقتیں پیش آتی تھیں، بعد میں احمد آباد کا وہ پریس کسی وجہ سے بند ہو گیا جس کی وجہ سے رسالہ ''الدین'' چند مہینوں بند رہا،

تب مولانا نے بڑی ہمت کے ساتھ قوم سے چندے کی اپیل کی اور ''معین الدین'' پریس کے نام سے چندہ کیا اور پھر ''معین الدین'' پریس قائم کیا، جس سے دینی رسالے اور پمفلٹ؛ خاص کر کے رمضان المبارک کے موقع پر روزے کے مسائل، افطار کے مسائل، اعتکاف کے مسائل، زکوۃ کے مسائل وغیرہ خاص طور پر شائع ہوتے تھے، اس میں ایک جنتری بھی شائع ہوتی تھی کہ روزانہ سحری اور افطار کا وقت کیا ہے وغیرہ۔ غرض یہ ہے کہ اس رسالے نے قوم کی بڑی خدمات انجام دیں۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۹۵ تا ۹۷)

الدین کی زبان اور اس کا اسلوب:

تمام مسلمانوں میں علمی شوق اور مذہبی معلومات بہم پہنچانے کے لیے ہی آپ نے یہ رسالہ جاری فرمایا تھا اور فرمانِ الٰہی وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ کے بموجب اس کی زبان گجراتی اختیار فرمائی، اور گجراتی بھی وہ جو بالکل عام فہم ہو اور دیہاتی سے دیہاتی آدمی بھی اس کو سمجھ سکے۔ اسی بات کو لسانِ جامعہ حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں: الدین کے کچھ رسالے میں نے بھی پڑھے ہیں، اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ رسالے میں جو گجراتی زبان لکھتے تھے وہ علاقائی گجراتی زبان تھی، یعنی وہ گجراتی جو یہاں والے عام طور سے بولتے ہیں، مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بات سمجھ میں آئے، یہ نہیں کہ اپنی قلمی طاقت کو لوگوں کے سامنے جتلانے کے لیے اونچے

اونچے بلیغ مضامین لکھے اور اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے پھرے۔

(بانیٔ جامعہ نمبر: ۶۴، ۶۵)

الدین کے پلیٹ فارم سے ایک جرأت مندانہ اقدام:

جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں وہ زمانہ انگریزوں کی آمریّت کا تھا، ہندوستان کا بچہ بچہ انگریزوں کے مظالم سے لرزاں تھا، اس جنت نشاں ملک میں لوٹ کھسوٹ مچانے کے بعد اب اسے عیسائی اسٹیٹ بنانے کی تیاریاں زوروں پر تھیں، ایک طرف سرکاری مولویوں پر زرِّ خطیر خرچ کر کے ان سے اپنا کام لیا جارہا تھا تو دوسری طرف پادریوں کی فوج اپنا مشن انجام دے رہی تھی، الغرض! ترغیب وترہیب کے تمام راستے اس ناپاک عزم کو پورا کرنے کے لیے استعمال کیے جارہے تھے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے بڑے پیمانے پر مدرسوں کا جال بچھایا اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ نے تقریر وتحریر اور مناظرے کے ذریعے اس فتنے کا بھرپور تعاقب کیا، بانیٔ مرحوم ان ہی بزرگوں کے حقیقی جانشین اور سچے وارث تھے؛ اس لیے ''الدین'' کے پلیٹ فارم سے اس فتنے کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

چناں چہ حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: اس زمانے میں ایک بڑا فتنہ انگریزوں نے یہ بھی پھیلایا تھا کہ عیسائی مشنریاں کام کرتی تھیں اور انھوں نے پوپ کو بھیجا تھا کہ یہاں کے مسلمانوں اور دوسری قوموں کو

ورغلا کر عیسائی بنایا جائے، مولاناؒ نے محسوس کیا کہ یہ عظیم فتنہ ہے، عیسائی مشنریاں اوران کے لوگ مسلمانوں کو ورغلاتے اور اپنے نظریات خصوصاً حضرت عیسیٰؑ کی طرف غلط باتیں منسوب کر کے مسلمانوں میں پھیلاتے تھے، حضرت عیسیٰؑ کو نبی تو مسلمان بھی مانتے تھے، آپ کا تقدس تو مسلمانوں کے قلوب میں بھی تھا؛ مگر یہ لوگ صحیح تعلیمات سے ہٹ کر غلط نظریات پھیلاتے تھے۔ مولانا نے ایک مضمون نگار کو تیار کیا اور کہانی کے انداز میں قسط وار ایک سلسلہ جاری کیا، اس میں بیان کیا جاتا تھا کہ ایک لڑکی کو عیسائی مشنریاں کس انداز میں ورغلاتی ہیں؟ اس ماہنامے کے ذریعے لوگوں کو بتلایا کہ عیسائی مشنریاں اس انداز میں کام کرتی ہیں، ان کی باتوں میں نہ آؤ، حضرت عیسیٰؑ کا مبارک نام لے کر ان کی طرف غلط چیزیں منسوب کر کے غلط عقائد آپ کو بتلا رہے ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اس سلسلہ وار کہانی سے ان پر بڑی زد پڑی اور اُس وقت جو عظیم فتنہ پنپ رہا تھا مولانا نے اس کا ایسا تعاقب کیا کہ لوگ متنبہ ہو گئے اور مشنریوں سے اپنے آپ کو دور رکھنے لگے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۸۳، ۸۴)

ہر بت کدے سے آئے گی آوازِ لاالہ
ہر میکدے کو بڑھ کے مسلماں کریں گے ہم

اس طرح اس رسالہ نے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دیں؛ مگر افسوس بانیٔ مرحوم کی وفات کے بعد افادۂ عام کا یہ سلسلہ جلد ہی بند ہو گیا۔ (تاریخِ جامعہ: ۴۱)

الدین کی نشأۃ ثانیہ:

عرصہ ہائے دراز کے بعد حضرت مولانا محمد سعید بزرگ سملکیؒ کے دورِ سعیدی میں اس کی نشأۃِ ثانیہ ہوئی، طلبۂ جامعہ کا موجودہ جداری پرچہ اسی الدین ماہنامہ کی یادگار ہے۔ اس نشأۃِ ثانیہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے محبوب العلما و الصلحا حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں: شروع میں جب میں یہاں جامعہ میں آیا تو میں نے ہی ہمارے مہتمم صاحب: حضرت مولانا محمد سعید نور اللہ مرقدہ (موجودہ مہتمم صاحب کے والدِ محترم) سے درخواست کی تھی کہ ہمارے جامعہ کے بانی حضرت مولانا احمد حسن بھامؒ ایک رسالہ گجراتی میں ''الدین'' کے نام سے نکالا کرتے تھے، اب وہ ختم ہو گیا، اس کا ایک نمونہ موجود تھا، تو میں نے کہا: اب ہمارے یہاں اس شعبے کے ماتحت طلبہ کی تحریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ: ایک دیواری پرچہ شروع کیا جائے اور چوں کہ ہمارے بزرگوں کا ایک نمونہ موجود تھا؛ لہذا دیواری پرچے کا نام بھی کوئی اور دینے کے بہ جائے ''الدین'' ہی دے دیا جائے، چناں چہ پہلا پرچہ جو نکالا گیا تھا اس کو نکالنے میں ہم نے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ (محمود الرسائل: ۱۹۰)

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ الدین کا اجرا فرمانے والی شخصیت کا نام ''احمد'' تھا اور جس ہستی کے ہاتھوں اس کی نشأۃِ ثانیہ ہوئی وہ بھی اسی مبارک نام سے موسوم ہے۔

یہ جداری پرچہ آج بھی جاری وساری ہے اور اب الحمدللہ یہ پرچہ

دیواروں کی حدود سے باہر نکل کر اپنے بانی وموجد کے طرز پر دوبارہ عامۃ المسلمین کی علمی تشنگی دور کرنے اور جہالت وضلالت کی جھلساتی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے عزم وارادے کے ساتھ سالانہ اشاعت کے ذریعہ منظرِ عام پر آرہا ہے۔

مطبع معین الدین کا قیام

الدین کے اس پلیٹ فارم سے جو خدمات آپ انجام دے رہے تھے، ظاہر ہے کہ اس بے سروسامانی کے عالم میں اور غیر ترقی یافتہ چھاپا خانوں کے دور میں جو پریشانیاں اور رکاوٹیں بانیٔ مرحوم کو پیش آتی ہوں گی اس کا اندازہ ہم نہیں لگا سکتے؛ مگر اس کے باوجود بڑے اہتمام سے ''الدین'' کو شائع فرماتے رہے؛ تا آنکہ احمد آباد کا وہ پریس جہاں سے الدین شائع ہوتا تھا کسی وجہ سے بند ہوگیا اور ''الدین'' کی اشاعت چند مہینوں تک موقوف رہی۔ یہ صورتِ حال بانیٔ مرحوم کے دلِ دردمند پر بڑی گراں گذر رہی تھی جس کی وجہ سے آپ نے پریس کھولنے کا عزم فرمایا، پریس کا تصور ایک عامی آدمی کے لیے مشکل ہی نہیں؛ ناممکن تھا، اس کے باوجود ساری کٹھنائیوں کے ساتھ اس عزم پر عمل پیرا ہوئے اور پریس کھول کر ہی دم لیا۔

ہم اپنے خون سے صحرا میں گل کھلا دیں گے
چمن میں کون بہاروں کا انتظار کرے

اس سے بانیٔ مرحوم کی باطنی کیفیت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ جس کام کا

عزم فرمالیتے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی چین کا سانس لیتے۔ مرحوم کی زندگی وفا کرتی تو شاید اپنی آنکھوں سے مدرسہ کو جامعہ کے قالب میں دیکھے بغیر چین سے نہ بیٹھتے۔

بہرحال اپنے تبلیغی مقاصد کے پیشِ نظر بانیٔ مرحوم نے ایک پریس قائم فرمایا اور اس کا نام ''معین الدین'' رکھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ بے سروسامانی کے عالم میں جذبۂ اخلاص سے پُر اس کارنامے سے کتنی خلق نے نفع اٹھایا ہوگا، یہ پریس ضلع سورت کے اولین اسلامی پریس میں شامل تھا، اس کے ذریعے سے جہاں ایک طرف الدین کی اشاعت میں آسانی ملی تو دوسری طرف تبلیغی مقاصد کی تکمیل میں سہولت میسر آئی، صد حیف کہ یہ پریس (مطبع) بھی بانیٔ مرحوم کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ (تاریخِ جامعہ:۴۱)

بانیٔ مرحوم کا یہ مبارک کارنامہ اور اس کی اہمیت یہیں پر ختم نہیں ہوتی؛ بلکہ بعد کے ادوار میں بھی اس کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی، چناں چہ بانیٔ مرحوم کے شاگردِ رشید، سابق مہتمم جامعہ حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب بسم اللہؒ اس حقیقت کو بیان فرماتے ہوئے شکوہ کناں ہیں:

فی زماننا اشاعت وتشہیر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، اور تشہیر کے اسباب میں سب سے بڑا سبب ہے کہ کسی کے پاس پریس ہو، کوئی ذاتی اخبار ہو، جامعہ کا ذاتی پریس ہوتا تو یہ تعلیمی خدمت کے علاوہ قوم وملت کی تقریر وتحریر سے

بھی خدمت کرتا۔ خدا تعالیٰ مرحوم مولانا بھام صاحبؒ کی قبر کو نور سے بھر دے کہ انھوں نے اس کی اہمیت کو سمجھ کر ابتدائی زمانے میں- جب کہ جامعہ کی بنیاد چھوٹے سے ستون پر تھی- ایک پریس ''معین الدین'' کے نام سے جاری کر کے قوم کی اچھی خدمت کی تھی؛ مگر بعد میں یہ پریس وغیرہ باقی نہ رہ سکا، جس سے جامعہ کی خدمات کی کما حقہ اشاعت نہ ہوسکی۔ ہمارے پاس رقم ہوتی اور قوم کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوتی تو ہم کب سے پریس اور ''الدین'' کو جاری کر دیتے۔

(روئداد جامعہ ۱۳۶۲ھ بہ حوالہ نقوشِ بسم اللہ ۱/ ۲۶۴، ۲۶۵)

پھر حضرت مولانا محمد سعید بزرگ کے دورِ اہتمام میں بھی ''الدین'' اور ''معین الدین'' کو دوبارہ جاری کرنے کا عزم وارادہ ظاہر کیا گیا، ۱۳۸۴ھ کی روئیداد میں اس کا ذکر موجود ہے۔ (تاریخِ جامعہ: ۱۸۶)

اِن واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بانیٔ مرحوم کی تڑپ اور کُڑھن کس قدر اعلیٰ تھی، خدا کرے کہ آپؒ کی یہ فکریں جلد اپنا اثر دِکھائیں، اور ہماری گنہگار آنکھیں ''الدین'' اور ''معین الدین'' کے فیض کو دوبارہ اسی آب وتاب کے ساتھ پھلتا، پھولتا ہوا دیکھیں۔

کتب خانہ

بانیٔ مرحوم کی جامع شخصیت کا اندازہ لگائیے کہ ایک طرف مدرسہ میں سرمایے کی فراہمی کے لیے گھر گھر اور در در؛ دستک دیتے ہیں تو دوسری طرف تعلیمی

معیار کی بلندی کی خاطر چن چن کر ملک کے ماہرینِ فن کا تقرر فرماتے ہیں، کہیں بدعات وخرافات کے سیلاب پر بند باندھنے کے لیے ماہنامہ ''الدین'' شائع فرمارہے ہیں تو کہیں اِسی بند کی مضبوطی اور افادیت کے پیشِ نظر پریس کا کاروبار سنبھال رہے ہیں، اتنی ہمہ گیر مشغولیات نے آپ کو بلند عزائم سے غافل نہ رکھا؛ بلکہ ذہن میں جس جامعہ کا تصور تھا اس اعتبار سے کتابوں کی فراہمی کی فکریں بھی فرمارہے تھے، چناں چہ ''قطرہ قطرہ دریا شود'' کی مَثَل کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کتب خانہ کو آباد فرمانا شروع کیا۔

تعارفِ جامعہ ص/ ۲۰ پر مرقوم ہے: ''مدرسہ تعلیم الدین کی روئیداد سے معلوم ہوتا ہے کہ تاسیس کے دو تین سال کے بعد ہی متعدد فنون کی کتابیں جمع ہوچکی تھیں''۔ اور آج قطرے قطرے سے بنا یہ تالاب بحرِ زخّار کا روپ دھار کر ہندوستان کے عظیم کتب خانوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ یقیناً اس میں بانیٔ مرحوم کی بصیرت اور خلوص وللّٰہیت کا اثر آج بھی موجود ہے۔

اس کتب خانہ کے بارے میں حضرت قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ جس زمانہ میں جامعہ میں مدرس تھے، اس وقت کے اپنے تأثرات پیش فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' یہ کتب خانہ میرے لیے بڑا پرکشش تھا، مختلف علوم وفنون خصوصاً تاریخ وادب کی کتابیں خوب پڑھتا تھا اور اپنے ذوق کی باتیں نقل کرتا تھا۔ ایک

روز احمد امین کی ''ضحیٰ الاسلام'' کا مطالعہ کررہا تھا جس میں مشہور امام لغت وادب ابن الاعرابی کے متعلق ''کان اصله سندیاً'' دیکھا تو ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ اتنا عظیم امام لغت سندی الاصل ہے، معلوم نہیں کیسے کیسے اہلِ علم وفضل سندی ہندی ہوں گے جن کا ہم کو علم نہیں..... بس اسی وقت ابن الاعرابی کا تذکرہ نقل کیا اور اس کا سلسلہ چل پڑا، جو آخر میں ''رجال السند والهند'' کی شکل میں سامنے آیا..... رجال السند والهند کے مسودے کے پہلے صفحے پر یہ عبارت درج ہے: ''ابتداء التالیف فی ۱۲/ جمادی الاخری ۱۳۶۸ھ وذلك فی الجامعة الا سلامیة دابیل (سورت) التدوین جار''۔

میں کتب خانے کی نادر ونایاب کتابوں سے اپنے ذوق کی چیزیں نقل کرلیا کرتا تھا، چناں چہ ابوعلی قالی بغدادی کی کتاب ''الامالی'' سے ادبی شہ پارے بڑے سائز کے دس صفحات میں نقل کیے، جوکلبی کی ''کتاب الاصنام'' میں پڑے رہ گئے اور میں ان کو بھول گیا، اور قیامِ ممبئی کے دوران ۱۴/ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ کو مدرسہ فلاحِ دارین ترکیسر گیا، واپسی پر جامعہ اسلامیہ گیا تو اتفاق سے کتب خانے کے نوادرات میں ''کتاب الاصنام'' میں وہ صفحات مل گئے اور میں نے ناظمِ کتب خانہ سے اجازت لے کر اپنے پاس رکھ لیے جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں، اس کے اور بہت سے اقتباسات میں نے اس کتب خانے کے نوادرات سے لیے۔ عام طور سے مدرسوں کے کتب خانوں میں درسیات اور ان کے متعلق شروح وحواشی

ہوتے ہیں؛ مگر یہاں پر ہر علم وفن کی نایاب ونادر اور امہاتِ کتب تھیں، اس سے پہلے میں نے کسی مدرسہ میں ایسا کتب خانہ نہیں دیکھا، کتب بینی ومطالعے کا شوق بچپن سے تھا؛ اس لیے اس سے خوب خوب استفادہ کیا اور ''رجال السند والھند'' کی تالیف کی ابتدا یہیں کی''۔

(کاروانِ حیات از قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ: ۱۱۱، ۱۱۳)

یہ تو ایک مثال تھی؛ ورنہ اس کتب خانے کی برکت سے کتنی ہی تصانیف امت کو ملی ہوں گی خدا ہی بہتر جانتا ہے! یقیناً ان سب کی اشاعت وافادیت کا ثواب بانیٔ مرحوم اپنے مزار میں حاصل کرتے ہوں گے۔

تدریسی خدمات

بانیٔ مرحوم مدرسہ کے انتظامات میں الجھ کر درس وتدریس سے بھی غافل نہیں رہے؛ بلکہ اپنے قائم کردہ اس چھوٹے سے مدرسے میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، یہ بات گذر چکی ہے کہ آپ نے فراغت کے بعد سورت شہر میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر اپنے ہی گاؤں میں گھر پر پڑھانے کا سلسلہ شروع فرمایا۔ ظاہر ہے یہ مکتب کے طرز کی تدریس رہی ہوگی، جہاں آپ ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے ساتھ ناظرہ قرآن بھی پڑھاتے رہے، نقوشِ بسم اللہ ۱/ ۱۲۴ پر مذکور ہے ''حضرت مفتی اسماعیل صاحب بسم اللہؒ کی اہلیہ محترمہ کو بانیٔ جامعہ حضرت مولانا احمد حسن بھامؒ سے بھی شرفِ تلمذ حاصل تھا، جس زمانے میں وہ

ناظرہ پڑھ رہی تھیں عمر کوئی سات آٹھ سال ہوگی''۔

ان ہی کے حفیدِ محترم حضرت مفتی عباس صاحب بسم اللہ ڈابھیلی دامت برکاتہم اپنی دادی کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ۱۹۰۱ء میں میری پیدائش ہوئی اور مولانا نے ۱۹۰۸ء میں تعلیم الدین قائم کیا۔عصر کی نماز کے بعد مولانا بھامؒ ہمارے گھر تشریف لاتے، مجھے پڑھاتے، سبق یاد کراتے اور سنتے، پورا ایک پارہ میں نے مولانا بھامؒ سے پڑھا ہے اور جب سبق ختم ہوجاتا تو مجھے کہتے کہ تمہارے ابا افریقہ سے میٹھے دودھ کے ڈبّے لائے ہیں، اس کی چائے بنا کر میرے لیے لاؤ تو میں چائے پلاتی۔(بانیٔ جامعہ نمبر:۷۵،۷۶)

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بانیٔ مرحوم صرف رسمی تدریس پر اکتفا کرنے والوں میں سے نہیں تھے؛ بلکہ علمِ دین کی خدمت کا جذبہ آپ کو لوگوں کے دروازوں پہ دستک دینے پر مجبور کرتا، اور بے تکلف تشریف لے جا کر علم کی روشنی گھر گھر پہنچانے کا فریضہ بھی انجام دیتے۔مذکورہ بالا اقتباس میں ''عصر کے بعد'' کا لفظ بتاتا ہے کہ جس وقت عموماً آدمی دوست احباب سے ملاقات کر کے ذہنی تفریح کا سامان فراہم کرتا ہے اس وقت میں بھی اپنے تدریسی ذوق کو کام میں لاتے۔اسی وقت کی قدردانی اور خدمتِ دین کے جذبۂ صادق نے آپؒ کو اتنے عظیم مقام پر پہنچادیا۔

اسی کے ساتھ اپنے قائم کردہ مدرسہ میں عربی وفارسی کا درس بھی دیا ہے،

خود مفتی اسماعیل بسم اللہ صاحبؒ نے مدرسہ تعلیم الدین سملک میں فارسی وعربی کی تعلیم بانیٔ مدرسہ حضرت مولانا احمد حسن بھامؒ سے حاصل کی۔ (نقوشِ بسم اللہ: ۱/ ۱۱۳)

بانیٔ مرحوم کے ایک انتہائی چہیتے اور مخصوص شاگرد رشید حضرت مولانا علی محمد تراجویؒ (بانیٔ مدرسہ مفتاح العلوم تراج) کی سوانح حیات میں آپ کے اندازِ تعلیم وتربیت کی منظر کشی کرتے ہوئے مذکور ہے: مدرسہ تعلیم الدین سملک کے بانی اور دیگر اساتذہ ان سے بے حد مسرور اور خوش تھے، خصوصاً جوہر شناس محسن ومربی مولانا احمد حسن بھامؒ نے آپ کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی؛ بلکہ احسان کا معاملہ فرمایا اور اپنی نگہبانی میں جو کچھ پڑھایا اور آئندہ پڑھانا اور بنانا چاہتے تھے اس کا اظہار اس طرح فرماتے تھے: ''علی! میں تجھے پہلے منشی پھر قاری اور مولوی بناؤں گا''۔ (تذکرۂ فخرِ گجرات: ۳۷، ۳۸)

مدرسہ کے لیے مستقل زمین کی خریداری

سلسلۂ تعلیم سملک کی مسجد کے حوض پر جاری تھا، الدین کی اشاعت بھی یہیں سے ہورہی تھی اور معین الدین مطبع کی نگرانی بھی یہیں سے جاری تھی، مدرسہ میں کتب خانہ بھی ترقی پذیر تھا، غرض اسی طرح وقت گذرتا گیا اور طلبہ بڑھتے گئے، چناں چہ جگہ تنگ پڑنے لگی اور مدرسہ سملک سے (ایک روایت کے مطابق) ڈابھیل کے اونچے محلہ میں منتقل ہوا۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: ایک مرتبہ

اصلاح البنات کے بانی حضرت مولانا عبدالحق میاں صاحبؒ نے مجھے سنایا کہ جگہ تنگ پڑی اور وسیع جگہ نہ ملی تو یہ مدرسہ ڈابھیل منتقل ہوا اور جہاں آج جناب رشید بھائی پٹیل کا گھر ہے اس کے پہلے منزلے پر تقریباً تین سال تک یہ مدرسہ تعلیم الدین کی شکل میں چلتا رہا۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۳)

زمین کے انتخاب میں مولانا محمد علی جوہرؒ کا حصہ:

بانیٔ مرحوم کے تصور میں ایک ایسا بڑا جامعہ تھا جہاں سے پوری امت کی دینی حوائج پوری ہوسکیں؛ اس لیے جامعہ کے شایانِ شان جگہ کی تلاش شروع کی۔ تاریخِ جامعہ میں روئداد کے حوالے سے مذکور ہے: درس وتدریس کا سلسلہ اگرچہ سملک کی مسجد میں جاری تھا؛ لیکن وہ جگہ غیر مستقل اور ناکافی تھی؛ اس لیے ضرورت تھی کہ مدرسے کے لیے ایک مستقل اور وسیع جگہ حاصل کی جائے، اگر معمولی مکتب کے لیے زمین کی ضرورت ہوتی تو اس کا مل جانا چنداں مشکل نہ تھا؛ مگر مولانا کے پیشِ نظر ایک دارالعلوم کی بِنا تھی اور آپ ایسی جگہ کی تحصیل کی کوشش کررہے تھے جو ایک دارالعلوم کے شایانِ شان ہو۔ (تاریخِ جامعہ: ۴۱، ۴۳)

اس زمانے میں مہاراجہ گائیکواڑ (ریاست بروڈہ) کی جانب سے نوساری کے نائب صوبے دار (کمشنر) مولانا محمد علی جوہر تھے، مولانا کا مشورہ تھا کہ گاؤں کے باہر کوئی وسیع زمین حاصل کرنی چاہیے، چناں چہ دونوں بزرگوں نے ڈابھیل، سملک کے ہر چہار طرف گھوم پھر کر دیکھا اور بڑی جدوجہد کے بعد

ڈابھیل کی غربی جانب عیدگاہ کے مقابل ایک وسیع قطعۂ زمین خریدا، جہاں پر آج جامعہ قائم ہے۔ (تاریخِ جامعہ: ۴۳۔ اکابرینِ گجرات، گجراتی: ۴/ ۲۲۵)

چوں کہ مولانا محمد علی جوہر ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں ریاستِ بروڈہ کی ملازمت سے مستعفی ہو چکے تھے۔ (بیس بڑے مسلمان: ۷۹۲)

اس لیے ماننا پڑے گا کہ زمین کی خریداری تقریباً ۱۳۲۸ھ تک ہو چکی تھی، اس وسیع وعریض قطعۂ ارض کے خریدنے کے لیے سرمایے کا انتظام بھی ایک مسئلہ تھا؛ مگر بانیٔ مرحوم کے اخلاص اور عزم وہمت نے اس کام کو آسان کر دیا، یقیناً اس میں بانیٔ مرحوم کی اہلیہ محترمہ کے زیورات کا بھی حصہ لگا ہوگا۔

زمین کی تقدیس کی گواہی اکابر کی زبانی:

اس نوخرید جگہ کے بارے میں مولانا اسحاق جلیس ندویؒ نے اسی احاطۂ جامعہ میں بیان فرمایا تھا: ''یہی وہ دیار ہے جہاں عصرِ صحابہؓ اور عصرِ تابعینؒ میں قافلے آئے تھے، ہوسکتا ہے یہاں انھوں نے پڑاؤ ڈالا ہو اور رات کی تنہائی میں کوئی سجدہ کیا ہو''۔ (فضلائے جامعہ: ۲۱)

اسی بات کو حضرت مفتی عباس صاحب مدظلہ قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں، جس وقت حضرت مفتی صاحب عربی سوم میں زیرِ تعلیم تھے اس وقت مولانا اسحاق جلیس ندویؒ جامعہ میں تشریف لائے، عشا کی نماز کے بعد ان کا بیان ہوا، اس میں ایک عجیب بات ارشاد فرمائی: اس سرزمین پر اتنا بڑا ادارہ قائم ہوا ہے اور

اس کا فیض کہاں کہاں پہنچ رہا ہے! یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ ساحلی علاقہ ہے، اس ساحلی علاقے پر صحابۂ کرامؓ کی آمد ہوئی ہے، ظاہر بات ہے کہ صحابہؓ؛ صحابہؓ تھے، وہ اطراف وجوانب میں پھیلے ہوں گے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انفاسِ قدسیہ اس سرزمین پر بھی آئے ہیں اور سجدہ ریز ہوئے ہیں، معلوم نہیں کیا کیا دعائیں مانگیں اور کتنے آنسو بہائے؟ ان انفاسِ قدسیہ کی برکت صدیوں کے بعد اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ یہاں سے علم کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۲۰، ۲۱)

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید:

بعض ظاہر بینوں کو چھوٹے سے مدرسہ کے لیے اتنی بڑی جگہ خریدنے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی، انھوں نے چہ میگوئیاں شروع کیں، بانیٔ مرحوم کو طعنے بھی دیے۔ آپؒ ان نکتہ چینی کرنے والوں کے جواب میں نہایت خندہ پیشانی سے یہی فرماتے رہے: ''ابھی یہ کم ہے، اس سے بھی زیادہ زمین کی ضرورت ہوگی۔'' بانیٔ مرحوم کا وہ جواب آج حرف بہ حرف صحیح ثابت ہورہا ہے۔ (تاریخِ جامعہ: ۴۳)

جن کو نگاہ بصیرت نہیں ملی ان کا کام ہی اعتراض ونکتہ چینی ہوا کرتا ہے؛ مگر اولوالعزم لوگ وإذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما کا مصداق ہوتے ہیں۔ اسی کو قاری محمد یامین صاحب سہارن پوریؒ[1] یوں بیان فرماتے ہیں:

---

[1] آپ بانیٔ مرحوم کے دورِ اہتمام میں تو مدرس نہ تھے؛ اس لیے کہ آپ کا تقرر ۱۳۴۶ھ میں ہوا ہے؛ مگر بانیٔ مرحوم سے رشتۂ معاصرت ضرور رکھتے ہیں، آپ نے ایک عربی قصیدہ بانیٔ مرحوم کی حیات وصفات پر رقم فرمایا ہے۔

لوی جنبہ عن کل غر مکابر		وصبّر من صافاہ عند الترا حم

ترجمہ: آپ نے ہر بھولے بھالے مخالفت کرنے والے آدمی سے پہلو تہی کی، اور جس آدمی نے آپ سے خالص دوستی رکھی اس کو قابلِ رحم ہونے کی حالت (پریشانی) میں صبر کی تلقین کی (تسلی دی)۔

یہ بانیٔ مرحوم کی خداداد فراست تھی کہ چھوٹے سے مدرسے کے قالب میں ان کو ایک جامعہ نظر آرہا تھا، جو صرف ہندوستان ہی کو نہیں؛ بلکہ سارے عالم کو سیراب کرنے والا تھا، ایک مرتبہ حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہؒ کی اہلیہ محترمہ (حضرت مفتی عباس صاحب مدظلہ کی دادی اماں) کو- جس زمانے میں وہ ان سے ناظرہ قرآن پڑھ رہی تھیں- عالمِ جذب میں فرمایا تھا: ''آپ کی زندگی اگر دراز ہوئی تو دیکھو گی کہ میرے اس مدرسہ میں ولایت (انگلینڈ) اور ناتال (افریقہ) سے علم حاصل کرنے کے لیے طلبہ آویں گے''۔ (نقوشِ بسم اللہ: ۱/ ۱۲۴)

اس پیشین گوئی کی تصدیق کرتے ہوئے دادی اماں فرماتی ہیں: اُس وقت شعور بھی اتنا نہیں تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اِس زمانے میں ولایت اور ناتال سے پڑھنے کے لیے کوئی یہاں کیوں کر آئے! لیکن بعد میں میری آنکھوں نے دیکھا کہ افریقہ اور انگلینڈ کے کتنے بچے یہاں پڑھ رہے ہیں۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۷۶)

اور آج تو ہم اس پیشین گوئی کی صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

مسجد کی تعمیر

حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت ہجرت فرما کر مدینۂ منورہ تشریف لائے، سب سے پہلے تعمیرِ مسجد کی فکر فرمائی۔ (سیرتِ احمدِ مجتبیٰ: ۲/ ۱۰۳) اس لیے کہ مسجد ہی وہ مرکز ہے جہاں سے پورے علاقے میں رشد وہدایت کی سوغات تقسیم کی جاسکتی ہے۔ اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے بانیٔ مرحوم نے اس نوخرید زمین پر سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی، دارالطلبہ وغیرہ دوسری ضروریات کی اگرچہ سخت ضرورت تھی؛ مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کو مؤخر کرنا پڑا۔

(روئداد جامعہ، ۱۳۵۰ھ بحوالہ تاریخ جامعہ: ۴۳، ۴۴)

اسی جگہ مدرسہ تعلیم الدین، سملک سے ڈابھیل ہجرت کر کے آنے والا تھا اور اطرافِ عالم کو قرآنی وحدیثی انوارات سے منور کرنے والا تھا۔ جامعہ کی یہ ابتدائی مسجد جو دیکھنے میں چھوٹی اور اپنی سادگی کے ساتھ ساتھ خوش منظر تھی کس قدر علوم وفنون اور انوار وبرکات کا منبع بنی ہوگی! اس میں اپنے وقت کے جبالِ علم اور اساطینِ علم وفضل سجدہ ریز ہوتے ہوں گے، یہاں کی فضا کو خلوص وللّٰہیت اور مہر و وفا کی خوشبو سے معطر کرتے ہوں گے، راتوں کی آہ وزاری اور سوزِ دروں کے نغمے اس میں گونجتے ہوں گے اور کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ پر آج بھی ان قدسی صفات علما وطلبہ کے بقایا فیوض وبرکات گشت کرتے ہوں۔

چھوٹی سی مسجد جس کی دیوارِ قبلہ میں ایک محراب اور اس کے گرد دو دو

خوبصورت سی کھڑکیاں، تقریباً آٹھ/دس صفوں پر مشتمل یہ مسجد جنگل میں منگل کا سماں پیش کرتی ہوں گی۔ بہرحال مسجد کی تعمیر میں بھی بانیٔ مرحوم نے اس غربت و افلاس کے زمانے میں تگ ودَو فرمائی اور ساتھ ہی مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا؛ اس لیے کہ بدعات وخرافات کا جو رواج اس زمانے میں تھا وہ کیسے اس شمعِ علم کو روشن دیکھ سکتا تھا! بہرحال علم کی شمع جلی اور جہالت کی تاریکی نے اپنا دامن سمیٹنا شروع کردیا اور سملک کی مسجد میں جاری ہونے والا یہ مدرسہ اس نئی مسجد میں منتقل ہوا جو آگے چل کر علمائے ربّانیین کا مأویٰ ومسکن بنی۔

''تاریخِ جامعہ'' میں اس قدیم مسجد کے متعلق مذکور ہے: وہ قدیم مسجد اب باقی نہیں رہی، خستہ اور پرانی ہوجانے نیز جامعہ کی ضرورت کے لیے ناکافی ہوجانے کے سبب شہید کرکے اسی جگہ شاندار طویل وعریض مسجد، جامعہ کے حسبِ ضرورت موجودہ مہتمم حضرت مولانا محمد سعید بزرگ مدظلہ نے تعمیر کروائی۔ (تاریخ جامعہ: ۴۴)

حضرت مولانا محمد سعید صاحب بزرگؒ کی بنائی ہوئی اس مسجد کے متعلق ''تعارفِ جامعہ'' میں مذکور ہے: اس کا سنگِ بنیاد حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ اور اساتذۂ جامعہ نے رکھا تھا۔ جامعہ کی یہ مسجد خصوصیت کے ساتھ وارد ین و صادرین کو اپنی دل ربائی اور دل کشی کی وجہ سے دعوتِ نظارہ دیتی ہے، سادگی، نفاست اور حسن و جمال سب کچھ یکجا کردیا گیا ہے، مسجد کا مینارہ خصوصیت کے ساتھ جاذبِ قلب ونگاہ ہے۔ پھر اس مینارے کو اس طرح کارآمد بنایا گیا تھا کہ اس کے

اندرونی حصہ میں دارالافتاء کی جگہ نکالی گئی تھی، جہاں سے احکامِ اسلام کے انوار پھوٹ پھوٹ کر ہندو بیرونِ ہند میں سالکانِ راہِ دین کی رہنمائی کرتے رہے، طویل عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر دارالافتاء انور بلڈنگ میں منتقل کردیا گیا۔

چوں کہ جامعہ صرف تعلیمی درسگاہ ہی نہیں؛ بلکہ تبلیغی وخانقاہی سرگرمیوں کا بھی مرکز ہے، ہوسکتا ہے کہ قیامِ مدرسہ کے وقت بانیٔ مرحوم کے ذہن کے گوشہ میں ان فیض رساں سلسلوں کا خاکہ موجود ہو اور آپ کے علیم وخبیر پروردگار نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ بھی فرمادیا ہو، اسی پس منظر میں ''عہدِ سعیدی'' کی یہ مسجد ایک طرف طلبہ کے لیے تنگ محسوس ہونے لگی تو دوسری طرف خانقاہِ محمودیہ کے واردین کے لیے بھی ناکافی نظر آنے لگی، اسی حالت کے پیشِ نظر جامعہ کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا احمد بزرگ (ثانی) دامت برکاتہم نے اس کی توسیع فرمائی اور اس قدر وسیع، خوبصورت اور پرکشش مسجد تعمیر کروائی کہ ہر قسم کی ضرورت کے لیے کافی ہوگئی اور جامعہ کی عمارتوں میں فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونے کی حیثیت سے ممتاز نظر آنے لگی۔ بالکل صحیح فرمایا تھا مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب مدظلہ نے: یہ مسجد جب مکمل ہوجائے گی تو ایک فنی تحفہ اور تعمیر کا ایک نمونہ ہوگی ان شاء اللہ۔ اور کیوں نہ ہو کہ اس کی بنیاد میں روضۂ اقدس (علی صاحبہا الف الف صلاۃ وتحیۃ) کی مبارک مٹی تبرکاً ڈالی گئی ہے۔ (تعارفِ جامعہ)

اس کی ان ہی خصوصیات کے پیشِ نظر یہاں پورے صوبۂ گجرات کا تبلیغی

جوڑ بھی منعقد ہو چکا ہے، سالانہ جلسوں کا انعقاد بھی اسی میں ہوتا ہے، بزرگوں کی اصلاحی مجلسیں اور ختمِ قرآن وختمِ بخاری کی پر رونق و بابرکت محفلیں بھی یہیں اپنی نورانیت وروحانیت کی جلوہ سامانیاں بکھیرتی ہیں۔ یقیناً بانیٔ مرحوم کے اعمال نامے ان جلیل القدر خدمات کے ثواب سے آج تک لبریز ہو رہے ہوں گے۔

مطبخ اور ہال کی تعمیر

بانیٔ مرحوم کے عہد کی قدیم مسجد میں دائیں طرف (حی علی الصلوۃ کی جانب) حوض تھا، آپؒ نے اسی کے اوپر مہمانانِ رسول کی رہائش کے لیے ایک ہال تعمیر کیا تھا۔ (تاریخِ جامعہ: ۴۴)

یہ مدرسہ یقیناً صفہ کا نظارہ پیش کرتا ہوگا، جہاں طلبہ کی ایک ہی فکر تھی کہ کچھ سیکھنے کو مل جائے، کھانے اور پینے تک کا ہوش نہ تھا، کہیں سے کچھ آ گیا تو کھا لیا، نہیں تو پھر ''فاقہ'' کھا کر تحصیلِ علم میں مشغول ہو جاتے؛ اس لیے کہ یہ مقدس قافلہ اپنی ساری مصروفیات ومشاغل ترک کر کے ایک عظیم مقصد کے تحت یہاں جمع ہو چکا تھا۔

اس کے بعد مطبخ کی ضروریات اناج وغلہ جات کی ذخیرہ اندوزی کے لیے چند حجرے بھی تعمیر کروائے تھے۔ (تاریخِ جامعہ: ۴۴)

جس کی وجہ سے یہ کاروانِ علم وعمل غذائی ضرورت سے مستغنی ہو کر حصولِ علم میں منہمک ہو گیا۔ بس یہ تھیں بانیٔ مرحوم کے دور میں مدرسہ کی کُل تعمیرات جو اَب ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہیں؛ اس لیے کہ ۱۴۰۴ھ تک یہ ساری

تعمیرات منہدم ہوگئیں جس کا اب صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

اشرفی بلڈنگ

بانیؒ مرحوم اسی پر اکتفا کیے بیٹھے نہ رہے؛ اس لیے کہ ابھی مستقل درسگاہوں کی ضرورت باقی تھی، اپنے بس کے سارے حربے استعمال کرنے کے بعد اب سرمایہ اور پونجی ختم ہوچکی تھی؛ مگر ہمت وعزیمت کا یہ پہاڑ اس مشکل کو کسی طرح خاطر میں لانے کو تیار نہ تھا؛ لہذا اسی مقصد سے بحری سفر اختیار کرکے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر افریقہ پہنچے، جہاں آپ کے کچھ اعزا واقارب پہلے سے موجود تھے، بانیٔ مرحوم نے ایک معتد بہ رقم چندہ کرکے جمع فرمائی اور اسے جامعہ کی تعمیرات کے لیے روانہ کیا، اسی رقم کے اشتراک سے وہ عمارت وجود میں آئی جو آج جامعہ کی آنکھوں کا سرمہ اور برکت ونورانیت کا محور ومرکز ہے، جسے ''اشرفی بلڈنگ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایک طویل عرصہ تک اس میں درسِ نظامی کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۴۲۸ھ سے اس میں قرآن کریم کی زمزمہ خوانی اور خوش الحانی کی صدائیں گونج کر رہی ہیں، یعنی اسے دارالتجوید والقراءات بنادیا گیا ہے۔

اس کے سنگِ بنیاد کی تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں بالخصوص قاضی رحمت اللہ محدث راندیریؒ، مولانا نذیر میاں صاحب پالنپوریؒ، مولانا احمد بزرگؒ، مولانا عبداللہ بخاریؒ (مدرس دارالعلوم اشرفیہ)، مولانا محمد یوسف لاجپوریؒ وغیرہم جیسی نابغۂ روزگار شخصیتوں نے شرکت فرمائی تھیں، یہی وہ درسگاہ ہے جس

میں حجۃ الاسلام، محدث العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفسرِ قرآن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتیٔ اعظم ہند حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، شیخ طریقت مہاجر مدنیؒ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا محمد یوسف صاحب بنّوریؒ اور دیگر اکابرِ امت نے سالہا سال درس دیا، یقیناً ان بزرگوں کے انفاسِ قدسیہ سے اس کا ذرّہ ذرّہ اور چپہ چپہ معمور رہا ہے، ان کے علمی مضامین اور روحانی برکات سے یہ عمارت بقعۂ نور بن چکی ہے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اپنے والد ماجد حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے درس کا نقشہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں: ''جامعہ کی زندگی میں وہ لمحے بھی عجیب تھے، جب مفتیٔ اعظمؒ جوانوں کی طرح گھنٹوں درسِ بخاری میں مشغول رہتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ دار الحدیث میں انسانوں کے ساتھ فرشتوں کی جماعت بھی شریکِ حلقۂ درس ہے اور جنیدِ وقت سے استفادہ کر رہی ہے''۔ (آل انڈیا ریڈیو کشمیر سیکشن بحوالہ الجمعیۃ صفر ۱۳۷۵ھ بحوالہ تعارفِ جامعہ)

قسمت کی بات ہے کہ بانیٔ مرحوم اپنے کیے ہوئے چندہ کی محنت کا ثمرہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے؛ اس لیے کہ آپ کی وفات ۱۳۳۷ھ میں ہوئی اور وفات کے بعد اسی سن میں اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، اس کی تعمیر میں ۶۵/ ہزار کی لاگت لگی جس میں معتد بہ حصہ بانیٔ مرحوم کے فراہم کردہ چندے کا تھا۔ (تاریخ جامعہ: ۴۶)

الغرض! بانیٔ مرحوم کو اسے آنکھوں سے دیکھ کر دل میں خوشی ضرور ہوتی؛ مگر

وہ ان لوگوں میں نہ تھے جو اپنی محنت کا ثمرہ دیکھ کر خوش ہوں اور مقصد سے تغافل برتیں، انہیں اس کی پرواہ بھی نہ ہوگی؛ بلکہ اپنے وہّاب پروردگار سے بدلے کی امید میں محنت پہ محنت کرتے اس دنیا سے چلے گئے اور "ماأسئلکم علیه من أجر إن أجري إلا علیٰ رب العالمین" کا مصداق بن کر دکھا گئے۔

نہیں ہے پیرِ میخانہ؛ مگر فیضان باقی ہے
ابھی تک میکدے سے بوئے عرفانی نہیں جاتی

اصلاحی خدمات

بانیٔ مرحوم کی اس قدر ہمہ جہت مصروفیات کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ اپنے آپ کو خالص "انتظامی وعلمی مشاغل" سے وابستہ رکھتے اور مدرسہ، پریس اور ماہنامے کے ذریعے تشنہ لبوں کی سیرابی پر اکتفا کرتے؛ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بانیٔ مرحوم اصلاحِ معاشرہ کی فکروں سے بھی لمحہ بھر غافل نہ رہے، آپ کے ذریعے غلط رسوم ورواج کا ایسا خاتمہ ہوا کہ آج ایک صدی گذر جانے کے بعد ان رسوم ورواج کا تصور ہمارے لیے ناممکن سا لگتا ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو؛ اس لیے کہ آپؒ نے اس ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بطور نمونہ منتخب فرمالیا تھا، جس کی پوری زندگی عربوں کے جہالت بھرے معاشرے کی درستگی میں گذری اور جس نے اپنا خونِ جگر نچوڑ کر دنیا کے انتہائی گئے گذرے معاشرے کو تاریخِ انسانیت کے غایت درجہ مہذب اور متمدن معاشرے میں تبدیل کر دیا۔

اپنے اردا گرد پھیلے رسوم- جوعقائد کا ایک حصہ بن چکے تھے ان- کو دور کرنے کے لیے آپ نے درشت روئی اور سختی کا سہارا نہ لیا؛ بلکہ اثباتی پہلو اختیار فرما کر خاموشی سے کام کرتے رہے۔آپ کے اس خوبصورت طرزِ اصلاح کو حضرت مفتی عباس صاحب مدظلہ العالی یوں بیان فرماتے ہیں: اس زمانے کے حالات عجیب تھے، مولانا نے مثبت انداز میں کام کیا یعنی عوام سے- جو بدعات، خرافات، بدعقیدگی اور برے اعمال میں مبتلا تھی- تصادم وٹکراؤ والا رویہ اختیار نہیں کیا؛ بلکہ مثبت انداز میں ''تعلیم الدین'' کی شکل میں مکتب قائم کیا، مولانا کی سوچ یہ تھی کہ: ان بچوں کو تعلیم دو تو علم کی روشنی آئے گی، ان کے گھروں میں پہنچے گی، اس علم کی روشنی سے خود بہ خود بدعات وبدعقیدگی کی اندھیریاں آہستہ آہستہ چھٹتی چلی جائیں گی۔مولانا فراست سے کام کررہے تھے، کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا اور تصادم وٹکراؤ نہیں، بالکل اثباتی پہلو پر کام کیا، قوم کی اصلاح کی کڑھن ان کے دل میں تھی، معلوم نہیں رات کی تنہائیوں میں اٹھ کر اللہ سے کیا دعائیں کی تھیں کہ چند ہی سالوں میں اس کے اثرات وثمرات مرتب ہوتے گئے اور بدعات وخرافات ختم ہوتی چلی گئیں۔(بانیٔ جامعہ نمبر: ۷۷، ۷۸، بتغیر یسیر)

بانیٔ مرحوم کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ معاشرہ اصلاح کی طرف بڑھنے لگا، اس میدان میں نہ صرف آپ کو سینکڑوں مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا؛ بلکہ آپ کے بعد جس نے اس مشن کو اپنایا اسے بھی جاں گداز حالات پیش

آئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: بانیٔ جامعہ نمبر: ۲۵ تا ۲۸)

انجمن اصلاح المسلمین، سملک کا قیام:

اصلاحِ معاشرہ کی ان فکروں سے آپ کے دل میں ایک انجمن کے قیام کا داعیہ پیدا ہوا، چناں چہ اس کے لیے ایک مستقل انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا، جو آج تک ''انجمن اصلاح المسلمین، سملک'' کے نام سے اپنا کام کر رہی ہے۔ انجمن کی ایک رپورٹ میں مذکور ہے: ہماری انجمن کی بنیاد ۱۹۱۱ء میں ہمارے قائد، دور اندیش بزرگ حضرت مولانا احمد حسن بھام بانیٔ مدرسہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل کے مبارک ہاتھوں سے رکھی گئی، اسے ہماری خوش نصیبی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ (انجمن اصلاح المسلمین، سملک دستور، سنِ اشاعت: ۱۹۵۷ء گجراتی)

اس کا پس منظر اور اس کی خدمات کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد حفظ الرحمن صاحب سملکی مدّظلّہ فرماتے ہیں: مولانا کے مشن کا دوسرا رخ اصلاح تھا، مولانا کو اس کی اس قدر فکر تھی کہ جہاں آپ نے جامعہ جیسے ایک بڑے ادارے کی داغ بیل ڈالی وہیں مسلمانوں کی اصلاح کے لیے اپنے گاؤں سملک میں ''انجمن اصلاح المسلمین'' کی بنیاد بھی رکھی، مولانا کے ہاتھوں یہ بنیاد جس پس منظر میں رکھی گئی تھی اس کو بھی جاننا بہت ضروری ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا نے گاؤں اور آس پاس کے علاقوں میں بدعقیدگی، برے رواج اور گندی رسموں کا دور دورہ دیکھا تو اس کا جنازہ نکالنے کے لیے اس انجمن کی بنیاد رکھی تھی اور الحمدللہ!

مولانا کے اخلاص کی برکت کہیے یا ان کے جہدِ مسلسل کا نتیجہ کہیے! اللہ تعالی کے فضل وکرم سے مولانا کی اس اصلاحی سعی کے بعد سملک ڈابھیل اور آس پاس کے گاؤں سے بدعقیدگی ایسی رخصت ہوگئی کہ آج تک اسے اس جانب رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، الحمدللہ! ہمارے ان دیہاتوں میں اللہ تعالی کے فضل سے بدعقیدگی کا نام ونشان نہیں ملتا، یہاں فرقِ ضالّہ کا کوئی وجود نہیں۔

آگے مفتی صاحب اصلاح کا بنیادی مفہوم سمجھاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: اصلاح کا عام مفہوم ہے درستگی پیدا کرنا، پھر اس کے دو فرد ہیں (۱) اخلاقی اور معاشرتی بگاڑ کو دور کرنا (۲) بگڑے ہوئے آپسی تعلقات کو استوار کرنا۔

سلام ہو اس مردِ قلندر کی دیدہ وری کو جس کی دور بینی ودور اندیشی نے بہت پہلے اپنی نگاہِ بصیرت سے وہ مناظر مشاہَد کر لیے تھے جو آج ہم اپنی کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں، انہیں اپنی ایمانی فراست سے اس بات کی بھنک مل گئی تھی کہ اسلامی معاشرے کو اگر بچانا ہے تو اصلاح کے پلیٹ فارم سے ان دونوں ہی زاویوں پر محنت کرنی ہوگی، چناں چہ اس مقصدِ حَسن کی تکمیل کے لیے انھوں نے انجمن اصلاح المسلمین کی داغ بیل ڈالی۔

اسے انجمن اصلاح المسلمین کی پکڑ کا شاخسانہ ہی شمار کیا جانا چاہیے کہ آج بھی سملک گاؤں میں ٹی وی اور وی سی آر کسی ایک گھر میں بھی موجود نہیں ہے۔ (اللہ تعالی اس کی برکات کو تا قیامت باقی رکھیں، آمین) حضرت بھامؒ کی اصلاحی

مہم کا یہ عظیم کارنامہ صرف ایک گاؤں کے لیے شروع کی گئی کوئی جزوی کوشش نہیں تھی، بلکہ درحقیقت تمام مسلم معاشروں اور آس پاس کی اہلِ اسلام کی جملہ بستیوں کے لیے ایک نمونۂ عمل تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ اسلامی سلطنت میں عہدۂ محتسب پر فائز افراد کی جو خدمت ہوا کرتی ہے اس قسم کی اصلاحی انجمنیں اس کا کارگر اور مؤثر بدل ہیں۔ اللہ کرے ہماری یہ ''انجمن اصلاح المسلمین'' اپنی اصلی ڈگر پر چل کر جن بنیادوں پر اس کی ''حشتِ اول'' رکھی گئی تھی اس پر پھر سے ایک مرتبہ گامزن ہو، یہاں سے اصلاح کی ایسی ہوائیں چلیں جن کی ٹھنڈک مرحوم مولانا بھام کی روح کو سدا پہنچتی رہے، اور یہ انجمن مسلمانوں کے لیے لائقِ اتباع لائحۂ عمل پیش کر سکے۔ (ملخص از بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۳۰ تا ۱۳۵)

انجمن ناصر المسلمین ڈابھیل کی داغ بیل میں بانیٔ مرحوم کا حصہ:

اس کے علاوہ ایک اور انجمن ''انجمن ناصر المسلمین'' ڈابھیل (اونچا محلّہ) کے نام سے بھی تھی، جسے بانیٔ مرحوم کی خدمات نصیب ہوئیں، مدرسے کی تاسیس کے دو سال بعد ۱۹۱۰ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی، مشہور بزرگ صوفی عابد میاں عثمانی اور بانیٔ جامعہ حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ نے اس کا نام ''انجمن ناصر المسلمین'' رکھا تھا، آپ اس کے بانیوں میں سے تھے، اس انجمن نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اردو و گجراتی زبان میں اسلامی کتابیں خرید کر انجمن میں مطالعہ کے لیے رکھی گئیں؛ تاکہ علم کی روشنی پھیلے اور جہالت و بدعت کی ظلمت دور ہو، نیز بہت

سارے امدادی ورفاہی کام بھی اس انجمن کے تحت ہوئے اس کی خدمات پر مشتمل رپورٹ بھی بہ زبان گجراتی شائع ہوچکی ہے۔

(انجمن ناصر المسلمین ڈابھیل طریقۂ کار اور روئیداد، سنِ اشاعت: ۱۹۴۷ء گجراتی)

وعظ گوئی وفنِ خطابت

علمائے امت نے ہر دور میں دین کی تبلیغ واشاعت کے لیے مختلف طریقے اپنائے ہیں، خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے درمیان وقتاً فوقتاً وعظ فرماتے تھے۔ تاریخ میں ایک جلیل القدر تابعی محدّث حضرت عبید بن عمیرؒ کا نام ملتا ہے جن کا وعظ مشہور تھا، حضرات صحابہؓ بھی ان کے وعظ میں شرکت فرماتے تھے۔ عوامی اصلاح کے لیے تقریر وخطابت اور وعظ گوئی ایک اہم ذریعہ ہے، بانیٔ مرحوم کو اس فن سے بھی وافر حصہ ملا تھا، اور آپ نے اس راہ سے بھی دین کی خدمات انجام دی ہیں۔ مقدمۂ محمود الفتاویٰ (۱/۴۸) میں مرقوم ہیں کہ: ۱۳۲۶ھ میں مدرسہ تعلیم المسلمین واقع بندرگاہ بھروچ کا افتتاح مولانا سید ابوالفضل تجمل حسین صاحب فضلی مشہدیؒ نے فرمایا، جس کے پہلے سالانہ اجلاس میں مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ نے شرکت فرمائی اور پُراثر وعظ بیان کیا۔

جنگِ بلقان کے موقع پر خلافتِ اسلامیہ عثمانیہ ترکی کو بچانے کی خاطر جب پورے ہندوستان میں ایک تحریک چلی، تو بانیٔ مرحوم نے بھی ڈابھیل کی ''اونچا محلہ مسجد'' میں پُرزور تقریر کی، اور لوگوں کو سراپا ترکی کا جاں نثار اور فدا کار بنا دیا، اس

کا مفصل ذکر چند سطور کے بعد ہی آ رہا ہے۔

اسی طرح جب آپؒ نے مدرسے کی بنیاد رکھی اور مدرسے کی تحریک پر ایک جلسہ منعقد ہوا، تو آپ نے اس میں تقریر فرمائی، اور علاقے میں مدرسے کی اہمیت وضرورت بیان فرما کر لوگوں کو اس کی مدد کی طرف متوجہ کیا تھا۔

ان تمام واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ فنِ خطابت میں بھی آپ کو ملکۂ تامہ حاصل تھا، اور مختلف مواقع پر اس کو کام میں لا کر دینی خدمات انجام دیتے تھے۔

سیاسی خدمات

آپ کی خدمات کا دائرہ تعلیم واصلاح تک ہی محدود نہ تھا؛ بلکہ آپ کی نظر ملکی اور عالمی سیاسی حالات پر بھی رہتی تھی، چناں چہ جب جب بھی کوئی سیاسی تقاضا پیش آیا آپ مردانہ وار آگے بڑھے اور اس کی خاطر ہر ممکن قربانی پیش فرمائی، ''تحریکِ خلافت کے موقع سے جب ہندوستان بھر میں چندے کی اپیل کی گئی تو آپ نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ فرماتے ہیں: حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ کی ایک اہم خدمت ''تحریکِ خلافت'' کے لیے چندہ فراہم کرنا ہے، ۱۹۱۲ء میں مدرسہ تعلیم الدین کے وجود میں آنے کے چار سال بعد جس زمانے میں ''جنگِ بلقان'' ترکستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے درمیان واقع ہوئی، اس زمانہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک پر جگہ جگہ انجمن قائم

ہوئی، وہاں ترکستان میں ''ہلالِ احمر'' نامی انجمن قائم ہوئی اوراس نام سے پورے ہندوستان میں خوب چندہ کیا گیا۔اس موقع پر ''اونچا محلہ'' ڈابھیل کی مسجد میں جامعہ کے سابق مفتی اور مدرّس حضرت مولانا کاظم علی دہلویؒ اور حضرت مولانا احمد حسن بھامؒ نے پُرزور تقریر کی،لوگوں کو ایک دم تُرکی کا جاں نثار،فدا کار بنادیا اور بڑا چندہ جمع کرکے ترکی کے مجروحین کے لیے بھیجا گیا، چندہ پہنچانے کا کام حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ نے انجام دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب علمائے دیوبند کے سامنے تعلیم سے زیادہ اہم سلطنتِ عثمانیہ کی حفاظت اور حمایت تھی،اس کے لیے بڑی بڑی درسگاہوں میں تعلیم موقوف کردی گئی،اس موقع پر بھی خلافت کو بچانے کے لیے بانیٔ جامعہ حضرت مولانا احمد حسن بھامؒ نے بھرپور کوشش کی، یہ ان کی اہم خدمت ہے۔(بانیٔ جامعہ نمبر:۴۲،۴۳)

آپ کا یہی اسوہ تھا جس پر بعد کے ادوار میں جامعہ قدم بہ قدم چلا، یہاں کے اساتذہ اور فضلا نے ملکی تحریکوں میں زبردست قربانیاں پیش کیں اور ملک کی جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں: جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اگرچہ خالصتاً ایک علمی اور دینی درسگاہ ہے،جس کا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہونا چاہیے؛ لیکن اس کے اساتذہ کی ایک بڑی تعداد اہم قومی اور وطنی تحریکوں میں ہمیشہ پیش پیش رہی اور تعلیم وتدریس کے ساتھ اس نے وطن اور ملّت کے اجتماعی تقاضوں کو بھی پوری طرح پہچانا۔(نشریاتی تقریر آل انڈیا ریڈیو،کشمیر بحوالہ الجمعیۃ،صفر ۱۳۷۵ھ)

بے شک جنگِ آزادی میں جامعہ کی خدمات آج تاریخِ جامعہ کے لیے کسی جھومر سے کم نہیں ہے، اس کی طرف ہلکا سا اشارہ پہلے بھی کہیں گذر چکا ہے۔

سفرِ افریقہ

افریقہ میں آپ کے اعزا واقارب پہلے سے مقیم تھے، آپ کے برادرِ بزرگ جناب ابراہیم صاحب بھامؒ بھی وہیں قیام پذیر تھے، بانیٔ مرحوم اور آپ کے مدرسہ سے خصوصی محبت کا تعلق رکھتے تھے، اس لیے بانیٔ مرحوم نے مقامی اور جنوبی افریقہ میں مقیم تجار حضرات کے مشورے سے جنوبی افریقہ کا سفر کیا، آپ کا یہ قیام تقریباً تین سال کے عرصہ پر محیط رہا، اس اعتبار سے آپ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ مطابق جنوری ۱۹۱۶ء میں ہندوستان سے نکلے، اور اپنے پیچھے مدرسہ کا انتظام جناب حاجی محمد ابراہیم پٹیلؒ① کے سپرد فرمایا۔ پھر حاجی محمد پٹیل نے اپنی وفات

---

① مرحوم حاجی محمد ابراہیم پٹیل کی وفات پر ماہنامہ ''الدین'' کے تأثرات پیش خدمت ہے:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد	روئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

ڈابھیل کے جانے مانے اور تجربہ کار پٹیل صاحب حاجی محمد ابراہیم گذشتہ ۱۶-۶-۶ کے روز ۶۵ رسال کی عمر پاکر مختصر سی علالت کے بعد اس فانی دنیا کو چھوڑ کر سکون کی دائمی زندگی کی جانب چل نکلنے کی خبر یہاں درج کرتے ہوئے دل غم سے مغموم ہوا چاہتا ہے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون

مرحوم قدیمی روایت کے پابند اور مکمل طور پر اسلام پر عمل کرنے والے تھے، قوم میں رائج متعدد قبیح رسومات کی مذمت کرتے تھے، ۱۹۱۰ر میں تقریباً ۲۵ ربستیوں کی تشکیل دادہ دینی اصلاحی کانفرنس میں مرحوم کو صدر نامزد کیا گیا تھا۔

تقریباً ۱۹۴۰ء سنبت سے اپنی بستی کی چودھراہٹ سنبھالتے تھے، اور مرتے دم تک ⇐

.....

➲ قابلیت اور ایمان داری کے ساتھ اس ذمہ داری کو نباہتے رہے۔ اعلیٰ افسران بھی ان کی کارکردگی سے خوش تھے، بستی میں کسی بھی نامناسب کام کا داغ آج تک ان کے سر پر نہیں آیا، نہ بستی کا کوئی شخص ان سے ناراض ہوا۔ دور اندیش، مستقل مزاج اور پُروقار ہونے کی وجہ سے ان کی مصالحت کے بعد کسی کو مزید مصالحت کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

پرانت پنچایت کے رکن بھی تھے، اور اس نمائندگی سے بڑی عوامی فلاحی خدمات انجام دیں، بستی کے کسانوں کی ضرورتیں بورڈ کے تعاون سے فراہم کرادیتے تھے، بستی کے انفرادی اور اجتماعی کاموں میں سب کے ساتھ یک دل و یک دست ہوکر شریک ہوتے تھے، بنابریں مرحوم عوام وخواص میں مقبول تھے۔

مدرسہ تعلیم الدین کے مہتمم جناب مولانا احمد حسن صاحب مدرسۂ مذکور کی بہتری کے لیے ٹرانسوال تشریف لے گئے، تب سے مدرسۂ مذکور کے مینیجر کے اختیارات ان ہی کے ہاتھوں میں تھے، اگرچہ مولانا کے گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، تاہم اس قلیل عرصہ میں بھی بہترین طریقہ سے اپنی ذمہ داری نباہی؛ بیماری کے سبب سے گھر رہتے ہوئے مدرسہ کی نگرانی اور امور کی انجام دہی مشکل تھی؛ اس لیے بستر علالت کے ساتھ مدرسہ کے مکان میں منتقل ہوگئے تھے۔ طلبہ کے قیام وطعام اور لباس کے نظام پر کڑی نظر رکھتے تھے، ذاتی طور پر شفقت کا معاملہ کرتے اور تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے، اور مختلف امور کو مختلف اوقات میں دریافت کرتے رہتے تھے۔

مرحوم کی وفات سے ان کے کنبہ وخاندان کو جو صدمہ وخسارہ ہوا اس سے تو انکار ہی نہیں؛ مگر ان کی وفات سے پوری بستی کو بڑا نقصان ہوا ہے، اور ہمیں تو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے؛ کیوں کہ مرحوم ہمارے مخلص ہم درد اور مشیر تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح کو سکون عطا فرمائے اور ان کے اہلِ خانہ کو اس صدمہ کو برداشت کرنے اور اس سے باہر آنے کی ہمت وقوت عطا فرمائے۔

چوں کہ مرحوم مدرسہ تعلیم الدین کے عارضی مینیجر تھے؛ اس لیے اپنی حیاتی ہی میں یہ ذمہ داری اپنے بھائی احمد ابراہیم پٹیل اور سیٹھ ابراہیم اسماعیل میاں کو سپرد کرگئے تھے، اور آخری اوقات میں بھی ان دونوں صاحبان کو مدرسہ کے متعلق سخت تاکید فرمائی تھی۔

مرحوم تقریباً ایک سال سے مریض تھے؛ اس لیے بستی کی چودھراہٹ میں ''انجمن ناصر المؤمنین'' کے صدر ہونہار نوجوان مسٹر عبدالحی حاجی ہاشم بھائی کو ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے، اور اس طرح ➲

کے موقع پر مدرسہ کا انتظام اپنے بھائی جناب حاجی احمد پٹیل اور جناب حاجی ابراہیم میاں سملکیؒ کو سونپ دیا۔ (ماہنامہ ''الدین'' جمادی الاخریٰ، رجب ۱۳۳۴ھ، شمارہ: ۴، ۵)

بانیٔ مرحوم کا یہ آخری سفر تھا، اس کے بعد انہیں وطنِ عزیز کی سرزمین کا دیکھنا نصیب نہ ہوا، جس وقت آپ نے یہ سفر اختیار فرمایا وہ زمانہ پہلی جنگِ عظیم کا تھا، جو عالمی پیمانے پر ۲۸ رجون ۱۹۱۴ء سے ۱۱ رنومبر ۱۹۱۸ء تک بپا تھی۔

(اسیرانِ مالٹا: ۱۴۲)

اندازہ لگائیے اس ہمت وعزیمت کے پہاڑ کا کہ مدرسے کی ضرورت کے خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا، حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے کہ اس سفر سے واپسی بظاہر مشکل ہی تھی؛ مگر اعتماد وتوکّل کا سرمایہ آپ کو کشاں کشاں افریقہ لے گیا، راستے میں جہاز کو ایک جزیرے پر روک دیا گیا، ہم سفر مسلمانوں کو دیکھا کہ نماز کی پرواہ ہی نہیں، ایک آہ نکلی اور محنت شروع کی، نماز کی دعوت دیتے رہے۔ اس زمانے میں حاجی ابراہیم میاں سملکی (عرف حاجی باوا) کے نام ایک خط لکھا جس میں نماز سے مسلمانوں کی غفلت پر بڑے درد وکرب کا اظہار فرمایا۔ اسی درد وغم کا اثر آج

➲ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں بھی کوتاہی نہیں برتی تھی۔

مرحوم ہمارے اس رسالہ کو بھی دل وجان سے پسند فرماتے تھے۔ بہرحال! ہم مرحوم کی وفات سے غم وصدمہ محسوس کرتے ہیں اور ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

(ماہنامہ الدین ماہ جمادی الاخریٰ رجب ۱۳۳۴ھ مطابق اپریل مئی ۱۹۱۶ء شمارہ: ۴-۵۔ بہ شکریہ: حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہٗ)

جامعہ کے ماحول میں موجود ہے کہ نماز کی پابندی اور صفِ اول کے اہتمام میں جامعہ دیگر جگہوں کے مقابلے میں ممتاز نظر آتا ہے۔

مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ اس اجمال کی مزید تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: افریقہ جاتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آ گیا تھا، وہ جس اسٹیمر سے جارہے تھے وہ ''زانزی بار'' نامی جگہ پر رک گئی اور مسافروں کو اتار دیا گیا، تقریباً پندرہ بیس روز وہاں رہے، وہاں آپ نے دیکھا کہ کشتی کے بہت سارے مسافر مسلمان تھے؛ لیکن جب نماز کا وقت آتا ہے تو ایک بھی نماز نہیں پڑھتا ہے، اس پر انھوں نے اُس زمانے کے مدرسے کے ذمہ دار جناب حاجی ابراہیم میاں صاحب سملکیؒ (عرف حاجی باوا) کے نام ایک خط لکھا، اس میں انھوں نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھا کہ: مجھے تعجب ہوا کہ اتنے مسلمان ہیں؛ لیکن ایک بھی ان میں سے نماز نہیں پڑھ رہا ہے۔ یہ واقعہ ایسے انداز میں لکھا ہے ایسا لگتا ہے کہ روتے روتے انھوں نے خط لکھا ہوگا۔ اِس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُن کے دل میں نماز کی کس قدر اہمیت اور امت کی بے دینی کا کتنا درد تھا۔

آج میں سمجھتا ہوں کہ الحمدللہ! ہمارے جامعہ میں جو کچھ نماز کی پابندی ہو رہی ہے اِسی مخلص کے اخلاص کی برکت ہے، بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جڑیں زمین کے اندر ہوتی ہیں اور اس کے پھل باہر نظر آتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ باہر کا

اثر ہے؛ لیکن حقیقت میں ان جڑوں کا اثر ہوتا ہے، سب مدرسوں میں نماز کا اہتمام ہوتا ہے؛ لیکن جس اخلاص کے ساتھ جامعہ کی بنیاد رکھی گئی اس کا اثر یہ ہے کہ جامعہ میں اس کا ایک خاص ماحول ہے، اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ تکبیرِ اولیٰ فوت نہ ہو۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۰۰، ۱۰۱)

سفرِ افریقہ کے مصائب کا سامنا اور آپ کی استقامت:

''بانیٔ جامعہ نمبر'' میں مذکور ہے کہ الدین کے ایک شمارے میں سفرِ افریقہ، اس کی صعوبتوں اور آپ کی استقامت کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے ایڈیٹر رقم طراز ہیں: ''ہمارے اس مدرسے کا اور اس کے خیر خواہوں کا بھی عجیب حال ہے، مدرسے کی خیر خواہی کے لیے مولانا احمد حسن بھامؒ بہت سارے مصائب جھیل کر افریقہ روانہ ہو گئے اور وہ اسٹیمر دلواڑہ (جو بہ قول مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم: ''دال گُبّا'' سے مشہور تھا) میں رک گیا، پھر نہ معلوم کہ کیا ہوا کہ ٹرانسوال افریقہ میں قدم رکھنے کے لالے پڑ گئے، اس پر مستزاد یہ کہ وہاں کے مدرسوں کے خیر خواہوں کے یکے بعد دیگرے نوٹس آنے لگے، یعنی مصائب کا سلسلہ چل پڑا، مولوی صاحب کا استقبال اور ان کی ضیافت ومہمانی، خیر وعافیت تو دور کی بات ہے، اس سے پہلے ہی مصائب کا سلسلہ شروع ہو گیا، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، کمزور دل کا یا اخلاص سے خالی کوئی شخص ہو تو وہ سرخم اور قدم بوس ہو کر ان سب ذمہ داریوں سے بری ہو کر الگ ہو جائے، اہتمام سے استعفا دے دیوے؛

مگر مولوی صاحب کا کلیجہ کس پتھر کا ہے جو تمام مصائب کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور آگے ہی آگے کام کیے جاتا ہے۔ ہمت وحوصلے کی ایسی مثال کسی اور قوم میں ہو تو اس کو سر پر بٹھا کر اس کی ضروریات پوری کرے؛ مگر جہاں جوہری نہ دار دوہاں جوہر کی قدر شناسی کون کرے''۔ (ایڈیٹر کی بات پوری ہوئی) ایسا لگتا ہے کہ وہاں آپ کو مختلف سازشوں کا سامنا تھا۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۵۰، ۵۱)

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں	چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

بہر حال یہ پُر مشقت سفر طے کر کے افریقہ پہنچے، قدم قدم پر جنگ کے آثار رہے ہوں گے، سمندر کے سینے پر جنگی جہازوں کی آمد ورفت ماحول کو مزید خوفناک بنائے دیتی ہوگی، بندرگاہوں پر پوچھ تاچھ اور تلاش وچیکنگ کے بے شمار مراحل سے گذرنا پڑا ہوگا۔ اسی جنگِ عظیم کی نحوست تھی کہ خلافتِ عثمانیہ کے علاقے دشمنانِ اسلام کے قبضے میں چلے گئے، حرمین شریفین اور مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی ہوئی اور پورا عالمِ اسلام چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر رہ گیا۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے: اسیرانِ مالٹا: ۱۲۰ تا ۱۳۷)

ان ہی عزائم وبلند ہمتیوں اور تکالیف ومشقتوں کو حضرت فضلی مشہدیؒ یوں بیان فرماتے ہیں:

منہمک تھے اس کی خاطر روز وشب حد سے سوا
عزمِ افریقہ کیا پھر چھوڑ کر فرزند وزن

جا بجا اس کے ہی ذکر وفکر میں مصروف تھے
راہ میں اس کے لیے کیا کیا سہے رنج ومحن

افریقہ کی خدمات

مسجد کا قیام اور رفاہی خدمات:

بانیٔ مرحوم کی دینی کڑھن آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی، جب آپ افریقہ پہنچے تو علاقے کی بے دینی کو دیکھ کر بڑے فکرمند ہوئے، چوں کہ بے دینی کے مقابلے کے لیے مسجد ایک مضبوط محاذ کا کام دیتی ہے؛ اس لیے وہاں بھی آپ ''تعمیرِ مساجد'' کے سلسلہ میں کوشاں رہے اور مختلف مسلمان بھائیوں سے مل کر ان کی ذہن سازی کرتے رہے۔ حسنِ اتفاق سے ایک تاریخی وثیقہ ہاتھ آیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بانیٔ مرحوم نے بنائے مسجد کا داعیہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کر کے اس کام پر انہیں ابھارا ہوگا اور جب خود مقامی باشندوں میں مسجد کی بنا کا شوق پیدا ہو گیا تو اپنے ہی ہم وطن صاحبِ جود وسخا جناب ابراہیم موسیٰ صاحب سملکیؒ کو آمادہ کر کے مسجد تعمیر کروائی، چناں چہ مسجد کے کتبے پر کندہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ جوہانسبرگ سے جانبِ جنوب میں ساٹھ کلومیٹر دور فَری نَخین (vereeniging) نامی سٹی میں مقامی لوگوں میں مسجد کی تعمیر کا شدید تقاضا پیدا ہوا، یہ تقاضا بانیٔ مرحوم کی مساعیٔ جمیلہ کا اثر رہا ہوگا؛ اسی لیے سنگِ بنیاد رکھنے کے موقع پر ان لوگوں نے جس شخصیت کا انتخاب کیا وہ آپؒ ہی کی ذاتِ گرامی تھی اور جس صاحبِ خیر بزرگ

کا نام شاعر نے لیا ہے وہ بھی آپ ہی سے ہم وطنی کا رشتہ رکھتے تھے جس سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی کی ترغیب وتشکیل پر وہ اس اخروی سرمایہ کاری کے لیے تیار ہوئے ہوں۔ واللہ اعلم

یہ مسجد ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں تعمیر کی گئی، ادھر ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں آپ کی وفات ہوئی اس اعتبار سے یہ خدمت آپ کی حیاتِ مستعار کے آخری ایام میں وجود پذیر ہوئی تھی، شہر کی مرکزی جگہ پر واقع یہ مسجد آج بھی ''فری نخن محمّدان مسجد'' کے نام سے موجود ہے اور برادرانِ اسلام کے سجدوں سے آباد ہے، جس وقت اس کی بِنا رکھی گئی تھی اس وقت اس کو آباد کرنے والے نمازیوں کی تعداد صرف آٹھ/دس تھی اور آج سینکڑوں مصلیان اس میں سجدہ ریز ہوتے ہیں یقیناً اس کا ثواب بانیٔ مرحوم کو روزانہ پہنچایا جاتا ہوگا۔

کتبے کے اشعار مندرجۂ ذیل ہیں:

شکر تیرا کس زباں سے یا الٰہی ہو ادا	۞	دل کا تو بَرلایا ہے کُل مؤمنوں کا مدّعا
ساکنانِ ''فری نخین'' کو نہایت شوق تھا	۞	ایک مسجد کی بِنا کا دل میں ہو صبح ومسا
ڈالا جس نے سنگ پہلا اِس کی جا ایجاد کا	۞	مولوی احمد حسن ہے نام اس دلشاد کا
قابلِ تعریف بے شک ہے وہی مردِ خدا	۞	جس نے سب اینٹوں کی دی اِس میں مدد بہرِ خدا
نام ابراہیم موسیٰ سملکی صاحبِ سخا	۞	دے اسے اقبال یاور اور سلامت رکھ، خدا!
اس مکانِ خوش فضا کو، خالقِ ارض وسما!	۞	لطف سے اپنے سدا آباد رکھ؛ ہے التجا

فکر میں تاریخ کی جب دلِ احقر ہوا	۞	پایا بس باغیچۂ راہِ حق سے مدّعا

''پایا بس باغیچۂ راہِ حق سے مدّعا'' یہ قطعۂ تاریخ ہے جس سے مسجد کی تعمیر کا سن ۱۳۳۵ھ نکلتا ہے۔

اس مسجد کے اطراف میں اوقاف کی عمارتیں ہیں جن کی آمدنی میں آج بھی خوب برکت ہے اور اس آمدنی کے ذریعے بہت سے مقامی ادارے اور تنظیمیں رفاہی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

نوٹ: مسجد کے سلسلے کی یہ ساری معلومات جناب حافظ سلیمان لاکھی صاحب زید مجدہ کے توسط سے موصول ہوئیں۔

مصالحت بین المسلمین:

اسلام نے اختلاف وانتشار کو ہمیشہ ناپسند کیا اور دلوں کے جوڑ اور آپسی میل محبت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے؛ اسی لیے فرقہ بندی کا سدِّ باب کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صلوا خلف کل برّ وفاجر (السنن الکبری للبیہقی: ۶۸۳۲) ہر نیک وبد امام کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو؛ دوسری حدیث میں ارشاد ہے: علیک السمع والطاعة في عسرک ویسرک ومنشطک ومکرھک وأثرة علیک. (مسلم ۲/ ۱۲۴) تجھ پر تنگی اور فراخی میں، خوشی اور ناخوشی میں اور تجھ پر کسی کو ترجیح دی جائے ایسی حالت میں، بہر صورت امیر کی بات کو سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے۔ اسی لیے آپسی مصالحت اور اصلاحِ ذات البین کو افضل ترین اعمال میں شمار کیا گیا

ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت ہے: الا اخبر کم بافضل من درجة الصیام والصلوة والصدقة؟ قالوا بلی قال: اصلاح ذات البین، وفساد ذات البین الحالقة [أی تستأصل الدین کالموسی للشعر]. (ابوداؤد: ۴۹۱۹۔ بذل المجہود: ۱۳/ ۳۲۶ مطبوعہ: اعظم گڑھ)

کیا میں تم کو روزہ، نماز اور صدقہ سے افضل عمل نہ بتاؤں؟ حضرات صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں (ضرور بتائیں)، فرمایا: آپس میں صلح کرانا۔ اور آپسی فساد نیکیوں کو مونڈ دیتا ہے، جس طرح استرہ بالوں کو مونڈ دیتا ہے اسی طرح یہ فساد دین کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔

بانیٔ مرحوم نے ان ہی نصوص پر عمل پیرا ہوتے ہوئے افریقہ کی سرزمین پر سب سے پہلے یہی خدمت انجام دی۔ چوں کہ آپؒ کے والد بھی بستی کے سربرآوردہ شخص ہونے کی وجہ سے نزاعی معاملات میں مرجع کی حیثیت رکھتے تھے، اور اکثر وبیشتر معاملات ونزاعات کو صلح صفائی کے ذریعہ طے کرواتے تھے اور یہی ایک کامیاب قاضی وجج کی علامت ہے، بانیٔ مرحوم میں بھی اپنے والد کی یہ خصوصیت موجود تھی، چناں چہ تاریخِ جامعہ میں مرقوم ہے:

(آپ جب افریقہ پہنچے تو وہاں مسلمانوں کے آپسی تعلقات کشیدہ تھے، اس لیے) ابتداءً ''انّما المؤمنون اخوة فاصلحوا بین اخویکم'' کا نہایت اہم فریضہ انجام دیا، آپ کی حسنِ تدبیر سے مسلمانوں میں آپس کی کشیدگی دور ہوگئی اور اتحاد واتفاق کا خوشگوار ماحول پیدا ہوگیا، یہ اتحاد مدرسہ کے حق میں بہت مفید ثابت

ہوا، سب نے متحد ہوکر مدرسے کی طرف دستِ اعانت بڑھایا اور تعمیر کے لیے ایک گراں قدر رقم جمع ہوگئی، جس کو آپ نے یہاں بھیج دیا۔ (تاریخِ جامعہ: ۴۴)

اندازہ لگائیے کہ قسّامِ ازل نے آپ کو کیسی صلاحیتیں عطا فرما رکھی تھیں اور امت کے افتراق وانتشار کا کس قدر غم دل میں پنہاں تھا، جس سے کام لے کر آپؒ نے متفرق قلوب کو مجتمع فرمادیا، اس کام میں یقیناً ایک طویل مدت صرف ہوئی ہوگی۔

مدرسہ تعلیم الدین کے لیے ایک عمارت کی خریداری اور اس کو ٹیکس سے محفوظ رکھنا:

بانیٔ مرحوم نے صرف نقد سرمایہ جمع کرنے کی تگ ودَو نہیں فرمائی؛ بلکہ اپنے قائم کردہ مدرسے کے لیے مستقل آمدنی کی سبیل بھی تلاش کرلی؛ تاکہ مستقبل میں مدرسے کو کسی قسم کی مالی پریشانی پیش نہ آئے۔ اس مقصد کی خاطر آپ نے ایک عمارت مدرسے کے نام سے خریدی؛ مگر حکومتِ افریقہ کے قوانین کے ماتحت اس پر کچھ ٹیکس عائد ہوتے تھے، بانیٔ مرحوم کا اخلاص کہیے یا ایمانی قوت! آپ نے اس عمارت کو اس قسم کے بوجھ سے آزاد کروالیا۔ اس کی تفصیل لسانِ جامعہ حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

استادِ محترم حضرت مولانا اسماعیل چاسوی صاحب دامت برکاتہم - اللہ ان کو صحت وتندرستی عطا فرمائے - کی روایت ہے کہ بانیٔ جامعہ جس وقت ساؤتھ

افریقہ تشریف لے گئے، تو انھوں نے وہاں ایک عمارت خریدی؛ تاکہ اس کی آمدنی جامعہ کے لیے فائدہ مند ہو۔ اس موقع سے وہاں کی حکومت کو ایک تحریر لکھی کہ قانون میں جو ہاؤس ٹیکس وغیرہ ہوتے ہیں، وہ سب اس مکان سے نہ لیے جائیں؛ اس لیے کہ اس کے کرایے سے ٹیکس کی رقم نکالیں گے تو بچے گا کیا! نقصان مدرسے کو پہنچے گا۔ حضرت مولانا کے اخلاص کا کرشمہ کہ حکومتِ افریقہ نے مولانا کی سیدھے سادے پُرفکر انداز میں لکھی ہوئی وہ درخواست منظور کرلی کہ ہاؤس ٹیکس وغیرہ سے اس عمارت کو معافی دی جاتی ہے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۶۷)

جنوبی افریقہ کی کمیٹی برائے جامعہ:

بانیٔ مرحوم نے جس طرح افریقہ میں مدرسے کی خاطر مستقل املاک اور جائیداد خریدیں اسی طرح اس کی حفاظت کا بھی نظم فرمایا، اللہ اکبر! کیسا دور اندیش آدمی تھا، آپ کے سامنے یہ احوال ضرور ہوں گے کہ اوقاف کی جائیدادیں خرد برد سے محفوظ نہیں رہ پاتیں، مرورِ زمانہ کے سبب اس پر غاصبین کا قبضہ ہوجاتا ہے؛ تاآنکہ اس کے لیے مستقل انتظام نہ کردیا جائے۔ چناں چہ آپؒ نے افریقہ کی ساری املاک کے نظم ونسق کے لیے ایک کمیٹی بنائی، اور ایک دو افراد کو متولی یا ٹرسٹی بنا کر مطمئن نہیں ہوگئے، پڑھیے اس موقع سے تاریخِ جامعہ کی عبارت: بانیٔ جامعہ نے جب سرمایے کی فراہمی کے لیے افریقہ کا سفر اختیار فرمایا تھا اس وقت جنوبی افریقہ میں ڈابھیل وسملک اور اس کے اطراف کے تقریباً تیس گاؤں کے باشندوں

پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی تھی، اس کا نام ہے ''ڈابھیل مدرسہ ٹرسٹ''، وہاں جامعہ کی املاک کا انتظام اسی ٹرسٹ کی زیرِ نگرانی ہے۔ آگے اس وقت کی کمیٹی کے اراکین کے اسمائے گرامی درج ہیں۔ مزید لکھتے ہیں: پانچ سال پر ان کا انتخاب ہوتا ہے، انتخاب کے لیے تیس گاؤں کے نمائندے جمع ہوجاتے ہیں، ان گاؤں کے نام یہ ہیں: (۱) ڈابھیل (۲) کالاکاچھا (۳) لاجپور (۴) بجم پور (۵) تراج (۶) ماکھنگا (۷) بارڈولی (۸) نوساری (۹) نصیر پور (۱۰) ٹکولی (۱۱) سملک (۱۲) تیلاڈا (۱۳) آسنا (۱۴) سچین (۱۵) کچھولی (۱۶) حاجی پورا (۱۷) تاڑیا (۱۸) وانکانیر (۱۹) بھٹئی (۲۰) واڑاگام (۲۱) ویسما (۲۲) کفلیتہ (۲۳) اکلیرا (۲۴) سامرود (۲۵) اٹاروا (۲۶) بلیشور (۲۷) خیرگام (۲۸) مولدھرا (۲۹) مانک پور (۳۰) ملک پور۔ (تاریخِ جامعہ:۳۰۶، ۳۰۷)

ایسا زبردست انتظام، کیا آپ کی دور بینی اور فراست پر دلالت نہیں کرتا ہے، اس سے پتہ چلا کہ آپ کے اندر حسنِ انتظام کا خصوصی ملکہ تھا۔

افریقہ میں ایک اور مدرسہ کا قیام:

بانیٔ مرحوم کی دخترِ محترمہ- جو مولوی زکریا بن مولانا یحییٰ بھام صاحب (ساؤتھ افریقہ) کی دادی ہوتی ہیں- فرماتی ہیں کہ: بانیٔ مرحوم نے افریقہ کا سفر متعدد مرتبہ کیا اور ان اسفار میں آپ کا قیام اکثر وبیشتر لورنیز وماركس (Lorenzo maks) میں ہوتا تھا جو آج کل مپوٹو (Maputo) کے نام

سے مشہور ہے اور موزمبیق کی راجدھانی ہے، آپ کے قیام کی برکات اور توجہات کا ثمرہ کہ وہاں بھی آپؒ نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جو آج بھی اپنے فیض سے امت کو فائدہ پہنچانے میں مشغول ہے۔ اس طرح آپؒ ایک نہیں، بلکہ دو مدرسوں کے بانی ہیں اور آپ کا فیض براہِ راست دو برِّ اعظموں میں جاری ہوا۔ بانیٔ مرحوم کے یہ اسفار خالصتاً لوجہ اللہ اور دین کی سربلندی ہی کی غرض سے ہوئے تھے۔

آپ کی خدمات کا دائرہ کتنا وسیع ہوگا اس کا حقیقی علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، ایک صدی کی طویل مدت نے بے شمار واقعات کو پسِ پردہ ڈال دیا جن کی یافت کی بہ ظاہر اب کوئی شکل وصورت نہ رہی، حتیٰ کہ خود آپ کے ایک قریبی دوست اور معاصر حضرت فضلی مشہدیؒ شہادت دیتے ہیں:

قوم کی وہ خدمتیں کی ہیں کہ جس کی شرح سے
واقعی سچ کہہ رہا ہوں بند ہے میرا ذہن

پھر ان کی جاں فشانیوں اور خلوص بھری جدوجہد کا نتیجہ کیا ہوا؟ قاری محمد یامین سہارنپوریؒ فرماتے ہیں:

دجیٰ منکرات الشرع زالت بنورہ		فبسط أنوار العلیٰ والمکارم

ترجمہ: ان کے نور سے شرعی منکرات کی تاریکی دور ہوئی اور انھوں نے سربلندی اور بھلائیوں کے انوارات کو عام کیا۔

نیز زمانے نے دیکھا کہ آپ کی خدمات کو دوام نصیب ہوا، اور ہماری

آنکھیں کھلے بندوں اس کا مشاہدہ کررہی ہیں؛ لیکن آج سے بہت پہلے قاری محمد یامین صاحبؒ اسے اپنی دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، فرماتے ہیں:

مدی الدھر تبقی باقیات مآثرا		ولا سیما للدین مثل الدعائم

ترجمہ: خصوصاً ان کے باقیات عظیم الشان دینی کارناموں کی حیثیت سے عمارت کے ستونوں کی مانند تاقیامت باقی رہیں گے۔

سفرِ آخرت

ہم اس سے پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ جس زمانے میں آپ نے یہ سفر اختیار فرمایا وہ جنگِ عظیم کے شباب کا زمانہ تھا جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں وہ حالات آئے کہ الامان والحفیظ! اِدھر ہندوستان فقر وفاقہ اور تنگ دستی کا شکار ہوا تو اُدھر افریقہ میں قیامت خیز طاعون پھیلا۔ مولوی زکریا (نبیرۂ بانیٔ مرحوم) اپنی دادی - جو بانیٔ مرحوم کی دخترِ نیک اختر ہوتی ہیں - کے حوالے سے اپنے مراسلے میں خبر دیتے ہیں:

''مارچ ۱۹۱۸ء میں (جو جنگِ عظیم اول کے شباب کا زمانہ تھا) ایک عالمی طاعون پھیلا جس میں پانچ کروڑ لوگ لقمۂ اجل بن گئے[1]، اسی کے جراثیم برِّ اعظم افریقہ

[1] جنگ وجدال کا نتیجہ بھوک مری اور بیماری کے سوا کیا ہوسکتا ہے اور خصوصاً جب کہ جنگ انسانی ہمدردی سے ورے محض ملک ومال اور ہوسِ اقتدار کی ہو تو ایسے بھیانک نتائج کا برپا ہونا یقینی ہے، امن وشانتی کا باعث تو وہ جہاد ہے جو اصولِ شریعت کی روشنی میں ہو یا کم از کم وہ لڑائی ملکی تحفظ اور رعایا کی حفاظت کے پیشِ نظر ہو؛ مگر ہم جس جنگ کی بات کررہے ہیں اس کی بنیادیں دیکھیے: ہوس پرستی، ملک گیری اور مخالفین کی تباہی جیسے غیر انسانی عناصر ہی نظر آئیں گے۔

تک پہنچے، مسبّبِ حقیقی تو اللہ عزّوجلّ ہے اور اسلام نے ہمیں ''لاعدوی ولاطیرہ'' کی تعلیم دی ہے؛ مگر عالمِ اسباب میں یہ واقعہ رونما ہوا کہ جنگِ عظیم کے سپاہیوں سے لدی جاروسلو (jaroslaw) اور ورنیج (Veronej) نامی دو کشتیاں افریقہ کے ساحل کیپ ٹاؤن (CapeTown) پر پہنچیں، ان دو کشتیوں میں بیمار سپاہی بھی موجود تھے، جو طاعون کے جراثیم لیے پھر رہے تھے۔ جب یہ لوگ ساحلِ افریقہ پر اترے تو ان کے ساتھ یہ طاعون بھی سرزمینِ افریقہ میں پنپنے لگا اور رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر پھیلتا رہا، نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے''۔

تاریخِ جامعہ: ۳۱۴ پر لکھا ہے کہ: ''اسی وبا میں مدرسے کے بہت سے بہی خواہان اور خود مولانا کے برادرِ بزرگ جناب ابراہیم بھام صاحبؒ بھی انتقال کر گئے، اس سے آپ کو بے حد اور ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچا''۔ ان جاں گداز حالات میں آپ واپسی کا قصد فرما ہی رہے تھے؛ تاکہ مدرسے کے انتظامات اور کاروبار کو آگے بڑھایا جاسکے؛ مگر تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، ان میں ردوبدل یا تقدیم وتاخیر کی کوئی گنجائش نہیں، انسان امیدیں باندھ سکتا ہے، تدبیریں کرسکتا ہے؛ مگر تقدیر نہیں بدل سکتا، چناں چہ ان جاں گسل صدمات نے آپ کی کمر توڑ دی اور یہی مرض آپ پر بھی حملہ آور ہوا جس سے آپ جانبر نہ ہوسکے اور بالآخر ۱۰ر محرم الحرام ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو بروز بدھ اپنے پروردگارِ حقیقی کی لقا سے باریاب ہوئے، اس طرح ہندوستان کے ایک قصبے سے چلا ہوا زندگی

بھر کا یہ تھکا ماندہ مسافر افریقہ میں جا کر ابدی نیند سو گیا، انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔

جان ہی دے دی جگر نے آج کوئے یار پر
زندگی بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

آپ کی وفات چوں کہ طاعون کے مرض میں ہوئی تھی، اور حدیث شریف میں ہے کہ طاعون کے مرض میں وفات پانے والا یعنی مطعون شہید ہے، اگر چہ فقہا نے شہید کی دو اقسام کر کے دنیوی اور اخروی کا فرق کیا ہے؛ مگر انعامِ خداوندی پانے اور الشہداء کی جماعت میں حشر ہونے کے لیے اتنا بھی کافی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے: الشهداء خمس المطعون والمبطون والغريق وصاحب الهدم والشهيد في سبيل الله. (ترمذی ۱/۲۰۴)

زندگی بھر تو آپؒ مدرسہ کی ترقی کی دھن میں لگے رہے، مرتے مرتے بھی اسی فکر پر پس ماندگان کو ڈال گئے، زندگی بھی دین کی خدمت میں اور موت بھی دین کی خدمت میں، اور قرآنی الفاظ میں ''قل إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين'' کا حقیقی مصداق بن کر دکھا دیا۔ زندگی کے حالات تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں، اب موت کے وقت یہ صورتِ حال کس طرح وقوع پذیر ہوئی؟ اسی کو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''سملک وڈابھیل اور جنوبی افریقہ کے لوگوں پر اس حادثہ (بانیٔ مرحوم کی وفات) کا اثر قدرتی طور پر غیر معمولی ہوا، اور مدرسہ کی ترقی سے عام دل چسپی اور بڑھ گئی''۔

(نشریاتی تقریر آل انڈیا ریڈیو کشمیر بحوالہ الجمعیۃ صفر ۱۳۷۵ھ)

اہلِ افریقہ اپنے اس پیشوا کے انتقال سے بے خود اور مجسم غم والم بن گئے اور کیوں نہ ہوں! جب کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو اس نے ان کی باہمی رنجشوں کو مٹا کر انہیں باہم شیر وشکر بنایا تھا، جس کی نصیحتوں اور وعظوں سے استفادہ کر کے انھوں نے اسلام کی امن وشانتی والی زندگی گزارنا سیکھا تھا، بہر حال اسی رنج والم کے ماحول میں دوسرے دن گیارہویں محرم کو قبل از غروب شمس بہتی آنکھوں اور روتے دلوں کے ساتھ اس عظیم انسان کے جسدِ خاکی کو- جو اَب خاکی نہیں؛ بلکہ نوری بن چکا تھا- برامفنٹین (Braamfontein) کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ یہ قبرستان جوہانسبرگ (Johannesburg) کے انٹرنیشنل ایرپورٹ سے صرف چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جو ایک عرصے سے بند پڑا ہوا ہے۔

حضرت فضلی مشہدیؒ کی زبانی اس روداد کو سنیے:

حق کی مرضی یوں ہی تھی کیا کیجیے جز صبر کے
سامنے تقدیر کے بیکار ہے سارا جتن
گیارہویں ماہ محرم روز پنج شنبہ کا تھا
قبل مغرب چھپ گیا زیر زمیں ان کا بدن
یا الٰہی مغفرت کی چادریں ان پر چڑھا
وقف اس کے واسطے کر اپنی رحمت کے چمن

بانیٔ مرحوم کے مزارِ اقدس کی منظر کشی کرتے ہوئے لسانِ جامعہ حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلّہ فرماتے ہیں: جس وقت افریقہ کا پہلا سفر ہوا تو میں نے ہمارے میزبانوں سے درخواست کی کہ مجھے بانیٔ جامعہ کے مزار پر حاضر ہونا ہے، مصروف ترین پروگرام کے باوجود بانیٔ جامعہ کے پرپوتے مولوی عبدالرحمن بھام زید مجدہ کے ساتھ ان کے مزار پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں آپ کو کیا بتاؤں! جیسے سیدھے سادے بانیٔ جامعہ تھے ویسا ہی سادہ ان کا مزار، مزار پر ایک لکڑی اور اس پر سادہ سا ٹین، اور اس پر انگلش میں صرف اتنا لکھا ہوا ہے ''مولانا احمد حسن بھام''، اس کے آگے ایک لفظ نہیں۔ میں نے ان کے پرپوتے سے کہا: ارے اللہ کے بندو! اتنا عظیم انسان، اتنے عظیم اس کے کارنامے! کم از کم اتنا تو لکھ دیتے کہ ''بانیٔ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک''، ان کی سن ولادت اور سن وفات لکھ دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی قبر پر جا کر دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۶۵، ۶۶)

تیرے قدموں میں سکوں آج بھی ملتا ہے مجھے
تیری تربت سے دعاؤں کی صدا آتی ہے

جامعہ کے شب وروز کے اعمال کا ثواب یقیناً ایک خوبصورت تحفے کی شکل میں آپ کو پیش کیا جاتا ہوگا، خدا کرے کہ ہم اپنے جسدِ خاکی کے ساتھ کسی وقت اپنے اس محسن کے مزار پر پہنچیں؛ ورنہ ایصالِ ثواب کے راستے روحانی

حاضری کا دروازہ تو ہمہ وقت کھلا ہوا ہے۔

آپ کے سانحۂ ارتحال کی خبر جب بذریعۂ تار ڈابھیل سملک پہنچی تو گھر گھر ماتم کدہ بن گیا اور ''موت العالِم موت العالَم'' کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ (تاریخِ جامعہ:۳۱۵)

تھا جن کے پاس زخم کا مرہم، کہاں گئے		جو دل کو جوڑتے تھے وہ معمار کیا ہوئے

یقیناً اُس وقت مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل کے در و دیوار بھی سراپا رنج وغم بنے ہوں گے، مدرسے کی چھوٹی سی مسجد، اس سے متصل حوض اور حوض پر طلبہ کی رہائش کا ہال، قریب میں چند حجرے جو مطبخ اور گودام کا کام دیتے تھے، یہی کل کائنات تھی جو بانیٔ مرحوم اپنے پیچھے چھوڑ کر افریقہ گئے تھے، جب اس قطعۂ زمین نے اپنے بانی کی وفات کی دل دوز خبر سنی ہوگی تو اس کی چیخیں نکلی ہوں گی، وہ زبانِ حال سے کہتا ہوگا: ''اے ملکوتی صفات کے حامل انسان! تو نے ہمیں آباد کیا تھا اور اس کی خاطر اپنے گھر تک کو ویران کر دیا تھا، تو نے ابھی اس آبادی وسرسبزی سے کچھ فائدہ بھی نہ اٹھایا تھا کہ موت کے بے رحم پنجوں نے تجھے مجھ سے جدا کر دیا اور تیری تربت کے درمیان سات سمندر حائل کر دیے؛ مگر تو مطمئن رہ! جس پروردگار کی خاطر تو نے مجھے آباد کیا تھا وہی میرا محافظ ہے، اور یاد رکھ! میری اس کوکھ سے تیرے عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والے فرزندان جنم لیں گے، جس دین کے غم میں تو نے جان دی ہے اس دین کے علَم کو عالم میں بلند کریں گے، جن بدعات و

خرافات کے خاتمے کا تو نے ارادہ کیا تھا ان کا تعاقب کرتے رہیں گے؛ یہاں تک کہ ان کو اس نواح میں قدم رکھنے کی بھی جرأت نہ ہوگی، غم نہ کر کہ اطرافِ عالم سے صدقۂ جاریہ کے تحفے اور ایصالِ ثواب کے ہدایا تیری تربت پر کشاں کشاں آتے رہیں گے اور رب کی رحمت ورضوان کا ابرِ باراں بن کر برستے رہیں گے۔

تیرے ہی حق میں شاعر نے کہا تھا:

نسیم الصبا بلّغ إلیہ تأدبا		تحیاتنا من کل بر واثم

ترجمہ: اے بادصبا! ادب کے ساتھ ان تک ہم میں سے ہر نیک وبد کا سلام پہنچا دے۔

مولوی زکریا اپنی دادی کے حوالے سے خبر دیتے ہیں کہ: آپ کی وفات کے موقع پر بہت سے علما آپؒ کے گھر تعزیت کے لیے تشریف لائے اور آپ کی بیٹی (مولوی زکریا کی دادی محترمہ) جو اس وقت تین سال کی تھیں ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ علما کی تشریف آوری بتا رہی ہے کہ بانیٔ مرحوم صرف افریقہ کی عوام ہی کے نزدیک نہیں؛ بلکہ علما کے یہاں بھی مقبول وپسندیدہ تھے۔ ان علما نے اسی پر بس نہیں کیا؛ بلکہ آپ کی زندگی پر مشتمل مختصر سوانحِ حیات بھی انگریزی زبان میں لکھ کر شائع فرمائی۔

مگر ہمیں اب تک اس سوانح کا - جو یقیناً ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے - سراغ نہ مل سکا۔ ظاہر سی بات ہے ''قدرِ جوہر جوہری می شناسد'' کے تحت

جب علما نے آپ کو ایک مقام عطا کیا اور عوام نے رنج وغم کا اظہار کر کے آپ کے ساتھ محبت وتعلق کا ثبوت دیا تو ''زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو'' کے پیشِ نظر آپ کی دنیا سے تشریف بری بھی اہلِ سما کے لیے خوشی ومسرت کا ذریعہ بنی ہوں گی اور اس ارضِ گیتی پر نہ جانے کتنے چاہنے والوں نے منامی بشارتیں پا کر اپنے غم کو غلط کیا ہوگا۔ واللہ تعالی اعلم

کہنے کو گل ہوا ہے فقط ایک ہی چراغ	سچ پوچھیے تو بزم کی رونق چلی گئی

بابِ دوم

اوصاف و کمالات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسان کی قیمت اوراس کی اہمیت کا دارومدار اس کے جسم کے خوب صورت، صحت مند وتوانا اور چست و چالاک ہونے پر ہرگز نہیں ہے؛ بلکہ دنیا میں جس جس کو بلند مقام عطا ہوا ہے وہ اوصاف کی بنا پر ملا ہے۔ بانیٔ مرحوم کے دستِ بابرکت سے صادر ہونے والے اس عظیم الشان کارنامے کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، خدائے بزرگ وبرتر نے تو ازل ہی سے طے کر رکھا تھا کہ ڈابھیل سملک کی سرزمین پر علم کے سوتے پھوٹنے ہیں، اور ایک عالَم کو یہاں سے سیراب ہونا ہے؛ مگر یہ کارنامہ کس کے ہاتھوں انجام پذیر ہو؟ اس کے لیے خالقِ کائنات نے بانیٔ مرحوم کی شخصیت کا انتخاب فرمایا، آخر کیوں؟ پھر وہی بات دہرادوں کہ محیّر العقول کارنامہ انجام دینے والے عموماً اعلیٰ ترین اوصاف کے حامل ہوا کرتے ہیں، بانیٔ مرحوم کی زندگی دیکھیے! سرتاپا اوصاف وخوبیوں سے لبریز نظر آئے گی۔ پناہ بہ خدا! مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ کا سراپا سراسر عیوب سے پاک تھا، اور آپ معصوم عن الخطا تھے؛ اس لیے کہ یہ تو صرف انبیا علیہم السلام کی شان کو زیبا ہے، ہاں! اتنا ضرور کہوں گا:

من ذا الذی ترضیٰ سجایاہ کلہا		کفی المرء نبلاً أن تعد معایبہ

ترجمہ: کون ہے ایسا جس کی تمام عادتیں پسندیدہ ہوں! آدمی کے شریف ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اس کے عیوب انگلیوں پہ گنے جاسکیں۔

اخلاص وللّٰہیت

بانیٔ مرحوم کا وہ امتیازی وصف جس نے آپ کو اپنے اقران ومعاصرین سے ممتاز کیا، وہ آپ کا خلوص اور اسلام ومسلمانوں کی فلاح وبہبودی کی دُھن تھی۔ یہی دو وصف ہیں جو مشترکہ طور پر تاریخِ اسلام کی بڑی بڑی ہستیوں میں آپ کو نظر آئیں گے، ماضی قریب ہی کا جائزہ لیجیے، اور قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتویؒ کو دیکھیے یا حضرت گنگوہیؒ کو، مولانا الیاس کاندھلویؒ کو دیکھیے یا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کو، مولانا علی میاں ندویؒ کو دیکھیے یا شیخ حسن البناؒ کو؛ غرض! جس انقلابی شخصیت کی حیاتِ مبارکہ کو اٹھایئے، آپ کو مشکل سے کوئی نظر آئے گا جس میں یہ دو وصف نہ ہوں۔

آپؒ کا جذبۂ اخلاص دیکھیے کہ ۱۲؍ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ کو جب مدرسہ کا سب سے پہلا جلسہ ہوا اور مدرسہ کے لیے قوانین بنائے گئے، تو ان قوانین کی ۳۷؍دفعات میں سے آپ کو ایک دفعہ بھی ایسی نہ ملے گی جس کی رو سے مدرسہ بانیٔ مرحوم کی ملکیت قرار پائے، یا کم از کم بانیٔ مرحوم کی اولاد ہی سے اس کا تعلق باقی رہے، صرف اتنا ہی نہیں؛ بلکہ دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ جب آپؒ کی وفات ہوگئی، تو آپ نے اپنی اولاد کے لیے اس قسم کی کوئی وصیت نہ چھوڑی اور نہ ہی آپ کی اولاد میں سے کوئی اس کا دعوے دار کھڑا ہوا۔

لسانِ جامعہ حضرت مفتی محمود صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: عام طور سے

جب کوئی ادارہ قائم ہوتا ہے تو ادارہ قائم کرنے والوں کے دلوں میں ایک چاہت ہوتی ہے اور ایسا گجرات، بیرونِ گجرات اور بیرون ممالک میں بھی ہوتا ہے کہ جب ادارے کا دستور اور بنیادی اصول وقواعد بنائے جاتے ہیں تو بانی حضرات ایسی کوئی دفعہ یا ایسا کوئی اصول ضرور بناتے ہیں کہ ہمارے خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد مستقبل میں مدرسہ کی انتظامیہ میں یا کمیٹی میں ذمہ دار ہوں یا کسی اہم ترین عہدے پر باقی رہے، ایسے بہت سے ادارے آج بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ بانیٔ جامعہ حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ کی قبر کو نور سے منور فرمائیں، آپ کو ایسی کوئی تحریر یا ایسا کوئی اصول یا ایسا کوئی وصیت نامہ نہیں ملے گا، جس میں بانیٔ جامعہ نے لکھا ہو کہ: میرے خاندان کا کوئی فرد آئندہ جامعہ میں کسی کلیدی عہدے پر قائم اور باقی رہیں۔ میں اس کو بانیٔ جامعہ کے اخلاص کی دلیل سمجھتا ہوں۔ اس کو لوجہ اللہ کام کہا جاتا ہے کہ کام ہوتا رہے پھیلتا رہے؛ چاہے ہمارے خاندان کا کوئی فرد اس میں باقی رہے یا نہ رہے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۶۳، ۶۴) بھلا ایسی حالت میں آپ سے دنیا طلبی اور حبِّ جاہ کا اندیشہ ہو تو کیوں کر!!!

''تاریخِ جامعہ'' میں مذکور ہے کہ: شروع میں آپ کے ساتھ صرف ایک اور مدرس تھے، جو قرآن شریف پڑھاتے تھے؛ لیکن مولانا نے جس دردمندی اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ اس کام کو شروع کیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مدرسہ برابر ترقی کرتا رہے، چناں چہ ایسا ہی ہوا، طلبہ کی کثرت ہوتی گئی اور مدرسین وملازمین

بڑھتے گئے۔ (تاریخ جامعہ ص: ۳۱۳)

بانیٔ مرحوم کے رفیقِ درس حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ آپ کے حالات میں لکھتے ہیں: مولانا مرحوم کی نیک نیتی اور خلوص و للّٰہیت کا ثمرہ ہے اور اسی کی خیر و برکت ہے کہ بعد الممات بھی ان کا روحانی فیض جاری ہے اور حضرت مولانا احمد بزرگ صاحبؒ جیسا بزرگ ان کا جانشین ہوا جن کی برکت سے یہ مدرسہ دار العلوم کے مرتبے تک پہنچ گیا۔

(ماہنامہ دار العلوم دیوبند، محرم الحرام ۱۳۷۳ھ بحوالہ ذکرِ صالحین ۲/ ۴۰۷)

وہی اپنے معاینہ میں رقم فرماتے ہیں: باوجود بے سروسامانی وقلّت آمدنی کے توکلاً علی اللہ قلیل مدت میں اس مدرسے کے طلبا نے جو غیر معمولی لیاقت پیدا کی اس کی وجہِ وجیہ منتظمین و مدرسینِ مدرسہ کی خلوصیت ہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ (نقوشِ بزرگاں ۱/ ۶۸)

آپ کے اسی جذبۂ للّٰہیت کا اثر ہے کہ علامہ کشمیریؒ جیسا محدث، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسا مفسر اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ جیسا فقیہ اور مفتی مدرسہ کو ملا، دار العلوم دیوبند کے بحرِ زخّار میں تلاطم کی وجہ سے جب برق و بخارات اٹھے، تو بانیٔ مرحوم ہی کے اخلاص نے انھیں اپنے جامعہ طرف کھینچ لیا۔ صرف اُسی زمانے میں نہیں؛ بلکہ آج تک زمانے کے اساطینِ علم وفضل اس کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں، اور جب تک بانیٔ مرحوم کے سچے جانشین اس کو ملتے رہیں گے یہ

کیفیت بھی ان شاء اللہ قائم ودائم رہے گی۔

اسی اخلاص کا اثر آج تک جامعہ کی فضا میں محسوس ہوتا ہے۔ استاذ محترم حضرت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی مدظلہ فرماتے ہیں: اس جامعہ میں داخل ہونے والے کئی اہلِ دل اور بزرگان سے ہم نے اپنے کانوں سے خود سنا، وہ اس بات کو محسوس بھی کرتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ جامعہ پر اتنے سال اور اتنی دہائیاں گذرنے کے بعد بھی آج جب ہم جامعہ میں داخل ہوتے ہیں تو یہاں روحانیت کا احساس پاتے ہیں۔ اگر ہم اور آپ کسی شخصیت کے تعلق سے بھلائی بیان کرنے بیٹھیں تو اس میں اِس کا امکان ہے کہ کچھ مبالغہ کر گذریں؛ لیکن جو اللہ کے اہلِ دل بندے ہوتے ہیں، اللہ نے جنھیں اپنے لیے منتخب کرلیا ہوتا ہے وہ بہت تول تول کر بولتے ہیں، ان حضرات کی ایک ایک بات صداقت پر مبنی ہوتی ہے۔ بہت سے اہلِ دل حضرات آج تک اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جامعہ میں آج بھی وہی روحانیت باقی ہے جو مرحوم نے اس کی بنیاد رکھنے کے موقع سے اس میں ودیعت کی تھی، یوں معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کی بنیاد، اینٹ اور گارے سے نہیں رکھی گئی؛ بلکہ اس میں کوٹ کوٹ کر اخلاص بھرا گیا تھا۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۲۵)

امت کا درد وغم

دوسرا بنیادی وصف امت کا درد وغم اور فکر وکڑھن ہے، بڑے افسوس کی بات ہے کہ عوام تو عوام ہیں ہی، ؛خواص کا طبقہ- جو علما وصلحا پر مشتمل ہے- اس قیمتی وصف

سے خالی نظر آتا ہے، اور یہ وصف گنتی کے چند افرادِ امت میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔

گذشتہ اوراق میں یہ بات گذر چکی ہے کہ: بانیٔ مرحوم نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں ہر طرف بدعات وخرافات کا طوفان برپا تھا، یہی بدعات وخرافات تھیں جو برگزیدہ ہستیوں کی موجودگی میں بھی ڈابھیل وسملک پر اپنا راج کر رہی تھیں، بانیٔ مرحوم ان سے اس قدر نالاں تھے کہ سورت شہر کی راحت وآرام والی ملازمت ترک کر کے وطن چلے آئے، اور خود کو اتنا تھکایا کہ اسی راہ میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

یہ واقعہ بھی گذر چکا ہے کہ بانیٔ مرحوم نے سمندری سفر کے دوران اپنے مسلم بھائیوں کو دیکھا کہ نمازوں کا اہتمام ہی نہیں کرتے، اس پر تڑپ اٹھے اور ایک درد بھرا خط اپنے رفیق حاجی ابراہیم میاں سملکیؒ کے نام تحریر فرمایا، جس میں لکھا تھا: ''مسلمانوں کا عجیب حال ہے کہ میں جس جگہ ٹھہرا ہوا ہوں وہاں بہت سارے مسلمان ہیں؛ لیکن نماز قائم کرنے والے نہیں ہیں'' اور بڑے درد کے ساتھ خط لکھا، وہ خط اگر کوئی اَب بھی پڑھے تو وہ رو دے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۴۹)

سفرِ افریقہ میں پیش آنے والے مصائب کا حال آپ پڑھ چکے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام مشکلات آپ کے مخالفین کی کھڑی کی ہوئی تھیں؛ مگر امت کا غم آپ کو سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ افریقہ میں مسلمانوں کے درمیان پھیلی اختلاف وانتشار کی وسیع خلیج دیکھ کر آپ کا قلبِ نازک درد سے

بلک اٹھا، اور جب تک مصالحت نہ ہوئی چین کا سانس نہ لیا۔ غرض زندگی کا ایک ایک واقعہ اس صفت کی عکاسی کرتا ہے۔ کاش! تاریخ مزید واقعات کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیتی تو ہم غفلت شعاروں کے لیے امت کے خاطر راتوں کو تڑپنے کا مزید سامان مہیا ہوتا۔ آخر مخالفتوں کے شدید طوفانوں میں علمِ دین کی شمع کیا راتوں کی آہ وزاری کے بغیر ہی روشن ہوگئی تھی!۔

''تاریخ جامعہ'' (ص: ۳۱۳) پر لکھا ہے کہ: ''مولانا کی زندگی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے وقف تھی، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت، ہر لمحہ اسلام ومسلمانوں کی فلاح وبہبود کی آپ کو دھن لگی رہتی تھی''۔

آپ کی ہر ہر ادا میں اسلام کی خدمت کا اثر نمایاں تھا؛ بلکہ آپ کی شکل وصورت ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ پر کسی چیز کا عشق غالب ہے، اور وہ چیز یہی دین اور علومِ دین کی خدمت تھی؛ اس لیے مولانا مدرسہ کی ترقی اور افادیت کی وسعت کے لیے برابر فکرمند رہے، اور اس کے لیے جو صورت بھی ہوسکتی تھی اسے عمل میں لانے سے دریغ نہیں کیا۔ (تاریخِ جامعہ ص: ۳۱۳)

حضرت مولانا محمد سعید بزرگ صاحب سملکیؒ آپ کے اس وصفِ خاص کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''خدا کے ایک برگزیدہ اور مسلمانوں کی دینی جہالت ورسوم پرستی سے دردمند حضرت مولانا احمد حسن بھامؒ نے بڑی بے سروسامانی کے عالم میں اس (جامعہ) کو شروع کیا''۔ (تاریخِ جامعہ: ۲۱)

مسلمانوں کی فلاح وبہبودی کی دھن اور مسلمانوں کی دینی جہالت و رسوم پرستی کا درد یہی وہ صفت ہے جس نے آپ سے محیر العقول کارنامے صادر کروائے ہیں۔ گذر چکا ہے کہ تحریکِ خلافت جب ہندوستان میں زور پکڑنے لگی اور ہر ہر مسلمان ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کو بچانے کے لیے بے چین ہوگیا، تو آپ کا دلِ دردمند کیسے خاموش رہتا؟ آپ نے اپنے وطن میں اس کی تحریک کی اور ایک اچھی خاصی رقم چندہ فرما کر روانہ کی۔

اس راہ میں آپ کا قلب وجگر بھی حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی طرح فکر وتڑپ کا شکار رہا ہوگا، جو فکر راتوں کو اٹھاتی اور اپنے رب کے آگے رُلاتی تھی؛ بلکہ ان دو بزرگوں تک کیا محدود! ہمارے سارے ہی اکابرین اس وصف سے متصف تھے۔ ان دو صفات کے ساتھ ساتھ آپ بے شمار اعلیٰ صفات کے بھی حامل تھے، آپ کی حیاتِ مبارکہ کے مطالعہ سے فہمِ نارسا جن کا ادراک کرسکی وہ پیشِ خدمت ہیں؛ ورنہ اس گنجِ گراں مایہ میں کیا کیا صفات تھیں خدا ہی بہتر جانتا ہے!

حصولِ علم کا شوق اور علمی انہماک

طلبِ علمی کے زمانے پر ایک نظر ڈالیے، اور خصوصاً لاجپور کے تعلیم وتعلّم کے دورانیے پر غور کیجیے! صرف چار سال کی مدت ہے، اور نحو کی ابتدائی کتابوں سے لے کر مشکاۃ تک کی تعلیم مکمل کرلی، وہ بھی اس طرح کہ جب دہلی جانا ہوا تو آپ کو وہاں کے مشہور مدرسوں میں داخلہ کا شرف بہ آسانی حاصل ہوگیا۔

لاجپور میں آپ کے جو استاد تھے: مولانا احمد میاںؒ، وہ آپ سے عمر میں صرف دوسال بڑے تھے۔ اسی نکتے پر حضرت مفتی رشید احمد صاحب لاجپوری مدظلہ اپنے تأثرات بیان فرماتے ہیں: حیرت کی بات ہے کہ آپ کے استاذ؛ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا احمد میاں صاحبؒ عمر کے اعتبار سے آپ سے صرف دو سال بڑے تھے۔ حضرت مولانا احمد میاں صاحبؒ کا سنِ ولادت ۱۲۹۴ھ ہے اور حضرت مولانا مرحوم کا سنِ ولادت ۱۲۹۶ھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ صرف دوسال کا فرق ہے، عبرت کی بات ہے: آج ہمارے اساتذہ ہم سے عمر اور علم وعمل میں بہت بڑے ہیں، اس کے باوجود ان سے جو استفادہ کرنا چاہیے ہم نہیں کر پاتے؛ لیکن یہ مولانا مرحوم کا ظرف تھا کہ عمر کے اعتبار سے صرف دوسال کا فرق ہونے کے باوجود ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۳۷، ۱۳۸)

تفصیلی واقعات بیان کرنے سے نقل وروایت تہی دامن ضرور ہے؛ مگر آپ کے علمی واصلاحی مضامین جو ''الدین'' کی زینت بنتے تھے، وہ آپ کے تبحرِ علمی کے ساتھ ساتھ پیچیدہ مسائل کو بھی عامی آدمی کے دل ودماغ میں اتارنے کے عجیب وغریب فن پر دلالت کرتے ہیں، نیز افریقہ کی مصالحت بین المسلمین کی کوششیں بھی یقیناً اعلیٰ علمی صلاحیتوں کی طلبگار ہیں، جس سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان موقعوں پر ظہور پذیر ہونے والی صلاحیتیں زمانۂ طلبِ علمی میں ہی پروان چڑھی تھیں۔

آپؒ ایک زبردست منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ علمی صلاحیتوں کے مالک بھی تھے، آپ کی علمی سرگرمیوں کی قدر و قیمت جاننے کے لیے آپ کے تلامذہ کو دیکھ لیجیے؛ اس لیے کہ پھلوں کو دیکھ کر درخت کی کیفیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ (آپ کے تلامذہ کا بیان آگے آرہا ہے)۔ نیز آپ کے رفیقِ کار حضرت مولانا فضلی مشہدیؒ کی زبانی بھی رسوخ فی العلم کا حال سنیے:

خادمِ اہلِ وطن تھے مولوی احمد حسن		ماہرِ علمِ شریعت، زینتِ بزمِ سخن

ایک معاصر کے قلم سے آپ کے لیے ''ماہر علم شریعت'' کے الفاظ یقیناً ایک زبردست شہادت ہے کہ انتظامی امور کے ساتھ ساتھ آپ علمی رسوخ کے بھی حامل تھے۔

علما کی قدردانی

چوں کہ آپ کا بچپن علما وصلحا کی زیارت کرتے گذرا تھا، آپ کے والدِ محترم علما کے قدردان تھے، ان کی میزبانی کا شرف حاصل کیا کرتے تھے، اس لیے علما کی قدردانی کا جذبہ آپ کو وراثت میں ملا تھا۔ اسی جذبے کا اثر تھا کہ آپ نے شعبۂ تجوید کے لیے ایک ماہر قاری حافظ محمد شریف خانؒ کو ''ٹونک'' سے بلایا اور کانپور سے خوش نویس منشی کو دعوت دی۔ (تاریخِ جامعہ: ۳۹، ۴۰)

مؤرخ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب مدظلہ سے بہ راہ راست معلوم ہوا کہ حضرت مولانا نذیر صاحب پالن پوریؒ کو بھی جامعہ کی تدریس کے لیے مدعو

فرمایا تھا؛ چناں چہ ''سوانح نذیری'' میں ہے کہ: بانیٔ مرحوم نے آپ کو دعوتِ تدریس دینے کے لیے ایک وفد پالن پور روانہ کیا، اور اس زمانے کے پانچ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ کی پیش کش کی؛ مگر علاقے کی بے دینی اور جہالت آپ کو دامن گیر تھی؛ اس لیے قبول نہ فرمایا۔ بعد کے ادوار میں آپ بلائے جاتے رہے؛ مگر ہر مرتبہ عذر ہی فرمایا۔ (سوانح نذیری ۲/ ۳۴۸)

خدمتِ علمِ دین

آپ کے اندر خدمتِ دین اور خصوصاً خدمتِ علم کا جذبہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا؛ اسی لیے تو اپنے مدرسہ میں بیسیوں انتظامات فرمائے: عمدہ سے عمدہ علمائے کرام اور ماہرینِ فن اساتذہ کا تقرر فرمایا، ان کی تنخواہ وحوائج وغیرہ کا نظم فرمایا، طلبہ میں اردو بولنے کا مزاج پیدا کیا؛ ظاہر ہے اپنی مادری زبان چھوڑنا اور نئی زبان سیکھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ یقیناً بانیٔ مرحوم کو ان کاموں کی انجام دہی میں کافی مشقت کا سامنا رہا ہوگا، پھر تعلیمی ترقی کے خاطر مختلف امتحانات کا نظام طے فرمایا، اور امتحان میں طلبہ کی لیاقت کو دیکھ کر کامیابی کا اطمینان بھی فرمالیا۔ صرف اتنا ہی نہیں، اس زمانے میں آمد ورفت کی تکالیف کے باوجود علمِ دین کی خدمت کا جذبہ آپ کو دور دراز کے اسفار پر بھی مجبور کرتا تھا۔ حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ رقم فرماتے ہیں کہ: راقم الحروف نے مولانا احمد حسن صاحبؒ کی معیت میں ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ پالن پور کا امتحان لیا ہے۔ (ذکرِ صالحین ۲/ ۲۰۴)

اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے حضرت فضلی مشہدیؒ کہہ اٹھے:

قلب میں تھا درد، علمِ دین کی ترویج کا		بچوں کی تعلیم کی رکھتے تھے سینہ میں لگن

اور قاری محمد یامین صاحبؒ اپنے عربی قصیدہ میں خدمتِ دین کے احوال کو یوں بیان فرماتے ہیں:

حميد نشأفي خدمة الدين مخلصاً		فقام بجدّ ثم صدق العزائم

ترجمہ: آپ خوبیوں والے تھے، اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کرتے رہے، اور دین کی خدمت؛ محنت وجاں فشانی اور پختہ عزائم کے ساتھ انجام دی۔

بانیٔ مرحوم کے رفیقِ درس حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ آپ کے حالات میں لکھتے ہیں: دین اور علومِ دینیہ کی خدمت کا آپ کو عشق تھا اور اسی راہِ عشق میں آپ نے اپنی عزیز جان، زن وفرزند کو بے بسی اور بے کسی کی حالت میں چھوڑ کر غربتِ سفر میں شہید ہوکر مالکِ حقیقی کے سپرد کردی۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، محرم الحرام ۱۳۷۳ھ بحوالہ ذکرِ صالحین: ۲/۴۰۶)

طلبہ پر شفقت اور اندازِ تربیت

طلبہ پر شفقت اور ان کی ترقی کی فکر بھی آپ کا مخصوص وصف تھا، جس کا اندازہ درجِ ذیل واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا علی محمد تراجویؒ لکھتے ہیں: ''میں مدرسہ تعلیم الدین میں تعلیم میں مشغول تھا، مدرسے کے ذمہ دار حضرات اور اساتذۂ کرام مجھ سے خوش تھے؛

لیکن اچانک ایک حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے میرا دل اٹھ گیا، اور میں نے کسی اَور مدرسہ میں جانے کے بارے میں سوچ لیا، کسی نے یہ خبر میرے مربّی حضرت مولانا احمد حسن بھامؒ تک پہنچادی، مرحوم کے دل پر اس کا کافی اثر ہوا، مجھے الگ لے جاکر خانگی طور پر بہت ہی محبت اور شفقت کے ساتھ وجہ پوچھی اور شکایت کے رفع کرنے کا وعدہ فرمایا، خوب اچھی طرح سمجھاتے ہوئے فرمایا: چاہے کچھ بھی ہو، تجھے مدرسہ نہیں چھوڑنا چاہیے؛ لیکن دل اچاٹ ہو چکا تھا، حضرت مولانا احمد حسن بھامؒ کے مرتبہ کا بھی خیال نہ رہا اور بغیر اطلاع کیے کٹھور میں داخلہ لے لیا، مجھے جانا تھا اور چلا ہی گیا؛ لیکن اپنے اس فیصلہ پر بعد میں کافی افسوس ہوا، اور آج بھی جب کہ اس واقعہ کو اپنے ہاتھوں لکھ رہا ہوں افسوس اور ندامت ہوتی ہے''۔

آگے لکھتے ہیں: ''رمضان المبارک میں مدرسہ تعلیم الدین کے چندے کے سلسلے میں مولانا احمد حسن بھامؒ کی تشریف آوری ہوئی تھی، تاکید کے ساتھ مجھ سے فرمایا تھا: یہاں کسی کو پتہ نہ چلے، میرا ارادہ آپ کو الٰہ آباد استاذ القرا حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحب کی خدمت میں بھیجنے کا ہے، آپ کے مکمل خرچ کا انتظام ہوجائے گا''، مقولہ مشہور ہے: ''اندھے کو کیا چاہیے؟ دو آنکھیں''، میں نے اپنے لیے یہ سعادت مندی سمجھی، مولانا مغفور کے حکم کی بجاوری کرتے ہوئے اور اپنی سعادت مندی سمجھتے ہوئے الٰہ آباد قاری صاحب کی خدمتِ اقدس میں پہنچ گیا''۔ (نقوشِ بسم اللہ: ۱/ ۵۱۳ تا ۵۱۶)

دیگر اداروں کے لیے فکرمندی

آپ پڑھ چکے ہیں کہ بھروچ میں ۱۳۲۶ھ میں جب ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی گئی، اور اس کا پہلا سالانہ جلسہ منعقد ہوا تو اس میں شرکت فرمائی؛ نیز اپنے دوست احباب کے ساتھ تشریف لے جاکر امتحان لیا اور امتحان کی حوصلہ افزا کیفیت بھی تحریر فرمائی، اس مدرسے کے بانی مولانا ابوالفضل تجمل حسین صاحب فضلی مشہدیؒ، بانیٔ مرحوم کے رفقا اور عزیز دوستوں میں سے تھے، یہی وجہ تھی کہ اس مدرسے کے ساتھ علمائے ڈابھیل کا خصوصی تعلق رہا، بانیٔ مرحوم کی وفاتِ حسرت آیات پر مولانا فضلیؒ نے ایک منظوم کلام ارشاد فرمایا تھا جو بعد میں تاریخِ جامعہ (ص:۳۸۹) کی زینت بنا۔ ہوسکتا ہے کہ اِس مدرسے کے بانی حضرت مولانا فضلی مشہدیؒ نے آپ ہی کے مشورے سے اس کا نام ''تعلیم المسلمین'' تجویز کیا ہو، واللہ اعلم۔ (مستفاد از مقدمہ محمود الفتاویٰ، ۴۸، ۴۹)

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بانیٔ مرحوم صرف ایک ادارے کو لے کر بیٹھنے والے نہ تھے، وہ اشاعتِ دین کی جو شکل بھی سامنے آتی اس کو کر گذرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ خیال ہوتا ہے کہ آج جامعہ کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور یہاں سے کئی ایک اداروں اور مکاتب کو رہنمائی مل رہی ہے، یہ سب بانیٔ مرحوم کی اسی فکر کا اثر ہوگا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ جب اپنی ابتدائی شکل میں وجود پذیر ہوا تب ہی سے اس کو مرکزیت کا مقام حاصل رہا ہے۔

مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تئیں جذبۂ خدمت

خدمتِ خلق کا جذبہ آپ کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا، ہر وقت دوسروں کو راحت پہنچانے کی فکر میں رہتے تھے، طلبۂ کرام سے خدمت لینا تو درکنار! خود ان کی راحت رسانی کے لیے بوجھ اٹھائے پھرتے تھے۔

مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ فرماتے ہیں:

''ابھی تین یا ساڑھے تین سال پہلے میری ایک شخص سے ملاقات ہوئی، جو ''تیلا ڈا'' کے رہنے والے تھے، انھوں نے ایک سو پانچ سال کی عمر پائی، انھوں نے بتلایا کہ: میں مدرسہ تعلیم الدین کا طالب علم ہوں؛ لیکن میں نے مولانا احمد بھامؒ کو نہیں دیکھا، ان کا انتقال ہوگیا تھا، ان کے بعد مولانا احمد بزرگ صاحبؒ کو مہتمم بنایا گیا تھا، میں ان کے زمانے میں طالب علم تھا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ: آپ کو مولانا احمد حسن بھام صاحبؒ کے متعلق کچھ معلوم ہے؟ تو انھوں نے ایک واقعہ سنایا کہ: مدرسے کی مستقل کوئی آمدنی نہیں تھی، مولانا نے سملک اور ڈابھیل کے مختلف گھروں میں چھوٹی چھوٹی ہنڈیاں رکھوادی تھیں، جس میں عورتیں کھانا پکاتے وقت چاول اور جوار وغیرہ کا آٹا ڈال دیا کرتی تھیں، پھر کچھ وقت کے بعد مولانا خود کسی خادم کے ساتھ جاکر محلّے محلّے پھر کر ان ہنڈیوں کو اٹھاتے، اور طلبہ کے لیے کھانے کا انتظام کرتے

۔اس زمانے میں ایک شخص نے ان کو راستے میں جاتے ہوئے کہا: اے

احمد! تو تو ''سائلہ'' بن گیا ہے، (سائلہ فقیر کو کہتے ہیں) تو آپ نے جواب دیا کہ: ہاں! میں سائلہ بن گیا ہوں؛ لیکن اپنی ذات کے لیے نہیں؛ طلبہ کے لیے، یعنی میں جو کچھ حاصل کرتا ہوں میرا پیٹ بھرنے کے لیے نہیں؛ بلکہ مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کی خدمت کے لیے اور ان کا پیٹ بھرنے کے لیے کرتا ہوں۔

ایک اور شخص نے چند روز پہلے بتایا کہ اس زمانے میں چھاچھ کا رواج تھا، مولانا طلبہ کے خاطر بارش کے موسم میں ''دھامن'' (ڈابھیل کے قریب ہندوؤں کے ایک گاؤں کا نام ہے) جاتے اور وہاں سے چھاچھ حاصل کرکے مدرسہ تعلیم الدین کے طلبہ کو پلاتے تھے۔ اُس وقت غربت کا یہ عالم تھا۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۹۸، ۹۹)

اندازہ کیجیے! طلبہ کی روحانی خدمت کے ساتھ ساتھ جسمانی خدمت کے لیے بھی اپنے آپ کو کس طرح تھکایا! حتیٰ کہ کسی نے بھیک مانگنے والے کے ساتھ تشبیہ دی، تو سینے میں موجود جذبۂ خدمت کے کچھ قطرات چھلک اٹھے اور فرمایا کہ: ہاں ہاں! لوگ اپنی اولاد کے لیے بھیک مانگتے ہیں تو شرماتے نہیں، میں اپنی روحانی اولاد کے لیے بھیک مانگ لوں تو کیا حرج ہے!!!۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

دادی اماں سناتی تھیں: میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ آتے تھے اور محلّہ محلّہ گھومتے تھے، کپڑے کی جھولی بنائی ہوئی تھی، اس میں

مٹکا انڈیل دیتے، ایک میں چاول اور دوسرے میں آٹا، بہ ذاتِ خود اپنی پشت پر اٹھاتے، جب کثیر مقدار میں ہوجاتا تو مدرسہ میں منتقل کرتے اور پھر واپس تشریف لاتے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۸)

انصاف پسندی

آج کے اس کرپشن اور رشوت ستانی کے دور میں اپنا حق ہی مل جائے تو بسا غنیمت ہے، کسی سے انصاف کی امید رکھنا تو بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے، پوری دنیا انصاف کی طلب گار ہے اور ظلم وناانصافی پر شکوہ کناں، یہ انصاف اگر کہیں مل سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ارشادات کو کما حقہ سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والوں کے پاس ہی مل سکتا ہے، چوں کہ بانیٔ مرحوم ان ہی پاکیزہ ہستیوں کی جماعت کے ایک فرد تھے؛ اس لیے عدل وانصاف بھی آپ میں بہ درجۂ اتم موجود تھا۔ کوئی جزئی واقعہ پیش کرنے سے نقل وروایت تہی دامن ضرور ہے؛ مگر حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب مدظلہ اپنے ایک بیان میں اس کی صراحت فرماتے ہیں: انتہائی انصاف پسند آدمی تھے، طلبا کے ساتھ انصاف کرنا ان کا اہم وصف تھا۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۴۷)

اسی اجمال کی قدرے تفصیل حضرت فضلی مشہدیؒ یوں بیان فرماتے ہیں:

سب سے یکساں گفتگو تھی سیٹھ ہو یا ہو فقیر
خیر خواہی سب کی تھی مدِّ نظر سرّ وعلَن

اشاعتِ دین کی دُھن

دین کی عمومی اشاعت کا ولولہ بھی آپ کو قدرت کی طرف سے عطا کیا گیا تھا؛ اسی لیے ''الدین'' ماہنامہ جاری فرمایا، اسی کی آسانی کے خاطر ''معین الدین'' نامی مطبع (پریس) کا نظم فرمالیا، اور بہ ذاتِ خود اپنے گراں قدر مضامین کے ذریعہ تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دیا۔

بانیٔ مرحوم کے مدرسہ کے اپنے مشاغل تھے، تدریس وانتظامی امور کی انجام دہی کا مشغلہ تھا؛ مگر اس کے ساتھ وہ اوقات جو عموماً تفریح وسیاحت اور دل ودماغ کی تازگی کے لیے ہوتے ہیں، ان میں بھی آپ پر یہی دھن سوار رہتی تھی۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم اپنی دادی اماں کا واقعہ سناتے ہیں: دادی اماں سناتی تھیں کہ میری پیدائش ۱۹۰۱ء میں ہوئی اور مولانا احمد حسن بھامؒ نے تعلیم الدین کی بنیاد ۱۹۰۸ء میں رکھی ہے، اسی زمانے میں میرے والد افریقہ سے تشریف لائے، مولانا احمد حسن بھامؒ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد میرے والد صاحب کے پاس آتے تھے، میرے والد ان کا بڑا اکرام کرتے تھے، اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے، میں چھوٹی بچی تھی، مجھے بلاتے اور قرآن پڑھاتے۔ مجھے مولانا احمد حسن بھامؒ نے براہِ راست ایک پارہ پڑھایا، میں شاگردہ تھی، جب سبق پورا ہوجاتا تو مجھ سے کہتے: تمھارے ابا افریقہ سے میٹھے دودھ کے ڈبے لائے ہیں، ان کی چائے بنا کر لاؤ! تو میں اس

میٹھے دودھ کی چائے بنا کر مولانا کی خدمت میں پیش کرتی تھی۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۲)

بانیٔ مرحوم کا یہ جذبہ صرف درس وتدریس تک محدود نہ تھا، بلکہ آپ عوام الناس تک دین کی باتیں پہنچانے کا بھی اہتمام فرماتے تھے۔

حضرت مفتی محمود صاحب مدظلہ بیان فرماتے ہیں: قاری عبداللہ میاں صاحب دامت برکاتہم (مہتمم جامعہ اصلاح البنات سملک) جو مرحوم بانیٔ جامعہ سے رشتے داری بھی رکھتے ہیں، انہوں نے مجھے ایک عجیب بات بتائی کہ ہماری خاندانی روایتوں سے ایک بات ہم سنتے آئے ہیں: بانیٔ جامعہ کا ایک عمل یہ تھا کہ وہ لوگوں کو دین اور حدیث کی چھوٹی چھوٹی باتیں سکھلایا کرتے تھے۔ مثلاً: لوگوں کو گھر میں کہتے کہ سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم کو خوب پڑھا کرو، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ تم کو جنت میں داخل فرمادیں گے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں- جو حقیقت وآخرت کے اعتبار سے بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں- سکھانے کا کام وہی آدمی کرتا ہے جس کے اندر نہایت اعلیٰ درجہ کا اخلاص (اور دین کے پھیلانے کی سچی تڑپ) ہو۔ موطا امام مالک وغیرہ میں ہم روایتیں پڑھتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ جب خلیفہ تھے اس وقت لوگوں کو عملاً وضو کرنے کا طریقہ سکھاتے تھے۔ گویا دین کی چھوٹی چھوٹی باتیں سکھانا اور حدیث کے اوراد واذکار لوگوں کو بتلانا بھی دین کا بہت بڑا کام ہے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۷۰)

توکّل علی اللہ

آپؒ کی ساری کراماتی نقل وحرکت کا سرچشمہ دراصل آپؒ کے دل میں موجود توکّل علی اللہ کا سرمایہ تھا، ظاہر ہے کہ جب قرآنِ کریم "ومن یتوکّل علی اللّٰہ فھو حسبہ" کا ایک عام وعدہ کرتا ہے تو پھر کونسا کام مشکل رہ جاتا تھا! اسی توکّل کا نتیجہ تھا کہ آپؒ کو اپنے چھوٹے سے مدرسہ میں افریقہ وانگلینڈ سے حصولِ علم کے لیے آنے والے طلبہ علم حاصل کرتے اُس زمانے میں نظر آرہے تھے جس میں اتنے طویل اور دور دراز کے اسفار کا تصور کسبِ مال کے لیے بھی دشوار تھا، چہ جائے کہ علمِ دین کا شوق لے کر مسافتوں کو قطع کرنا، یہ تو انتہائی مشکل تھا؛ مگر آج جامعہ میں آنے والا ہر وارد وصادر بانیٔ مرحوم کی پیشین گوئی کی تصدیق کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ بات بھی گذر چکی ہے کہ آپ نے انتہائی نامساعد حالات میں پریس جاری کیا، ماہنامہ الدین کی اشاعت کو اتنی وسعت دی کہ برما ورنگون اور کلکتہ تک اس کے شمارے جاتے تھے۔ خود مدرسہ کے لیے وسیع قطعۂ ارض خریدا اس امید پر کہ یہ مدرسہ ایک دن ضرور جامعہ بنے گا۔ یہ عزم وحوصلہ آپ کو کہیں سے ملا ہے تو اسی توکّل علی اللہ سے ملا۔

ایمانِ کامل اور یقینِ محکم

انسان کی حقیقی کامیابی وناکامی کا اصل دارومدار ایمان کی مضبوطی وکمزوری

پر ہے، جس کا ایمان مضبوط اور یقین محکم ہو اس کو دنیا کی کوئی طاقت نہ ڈرا سکتی ہے نہ جھکا سکتی ہے، اور نہ ہی اس کے عزائم کی راہ میں سدِّ باب بن سکتی ہے، ہم بانیٔ مرحوم کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ وصف بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ ہم جیسا کوئی انسان ہوتا تو غربت وافلاس اور فقر وفاقہ کو سامنے دیکھ کر تاویلات کا سہارا لیتا اور ایثار وقربانی اور جہد ومشقت کے مواقع پر اپنی جان چھڑا کر کنارہ کش ہو جاتا؛ مگر بانیٔ مرحوم کے ایمان کی پختگی کسی چیز کو سدِّ راہ ماننے کو تیار نہ تھی۔

حضرت مفتی محمد حفظ الرحمن صاحب سملکی مدظلہ اس بابت رقم طراز ہیں:

مولانا مرحوم کی زندگی کی ایک بہت بڑی خوبی ان کا مضبوط ایمان اور ان کا یقینِ کامل ہے، یہی وہ چیز تھی جس نے ہمارے اس خطّے سے بدعت کو دُم دبا کر بھاگنے پر مجبور کیا۔ بہت سے حضرات واقف ہیں کہ جن دنوں مولانا نے اس مدرسہ تعلیم الدین کی بنیاد رکھی تھی اس وقت ہمارے یہ سملک ڈابھیل نہ صرف بدعت کی لپیٹ میں تھے؛ بلکہ سارے اہلِ بدعت کے لیے گویا وہ مرکز بنے ہوئے تھے، یہاں بڑے بڑے عرس کا انعقاد ہوتا تھا اور قوّالیوں کی محفلیں سجتی تھیں اور نہ جانے عقائد کو خراب کرنے والی کیسی کیسی خرافات یہاں موجود تھیں، مولانا مرحوم کا مضبوط اور کامل ایمان تھا جنہوں نے اس سلگتے عالم میں مدرسہ تعلیم الدین کی بنیاد رکھی اور ان کے اسی یقینِ کامل کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جامعہ کو اتنی ترقی دی کہ آج شاید وباید دنیا کا کوئی گوشہ ایسا باقی ہو جس جگہ جامعہ کی روشنی براہِ راست

یا بالواسطہ نہ پہنچ رہی ہو۔ (بانیٔ جامعہ نمبر:۱۲۶)

تواضع وفنائیت

بے پناہ اخلاص اور امت کے درد وکرب نے آپ کو سراپا فنائیت کی خلعت پہنا رکھی تھی، جس کام میں لگتے اس میں فنا ہو جاتے، نہ حبِّ مال کا اثر نظر آتا نہ حبِّ جاہ کا۔ چندہ جمع کرنے نکلتے تو اَنانیت وخودرائی ذرہ برابر آڑ نہ بنتی، اور مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کا جذبہ آپؒ کو مجبور کرتا کہ جمع شدہ اناج کو اپنی کمر پر لاد کر مدرسہ کے گودام میں لے آئیں۔ طلبہ کو چھاچھ پلانے کے لیے تنِ تنہا پاپیادہ ''دھامن'' تشریف لے جاتے اور چھاچھ حاصل کر کے طلبہ کو پلاتے۔ جب آپ کو پتھر مارے گئے تو ان ہی مارے ہوئے پتھروں کو چندہ جان کر مدرسہ کی عمارتِ نَو کی بنیاد میں استعمال فرمانے کی نیت سے اٹھالیا:

پتھر لیے ہر موڑ پہ کچھ لوگ کھڑے ہیں
اس شہر میں کتنے ہیں میرے چاہنے والے

اندازہ لگائیے! ایک ایسا شخص جو بانی ومہتمم جیسے دو بلند وبالا اور ذمہ دارانہ منصب پر فائز ہو، ہم اسے دیکھتے ہیں کہ کہیں پتھر کھا رہا ہے تو کہیں بوجھ لادے مدرسہ کے کاموں میں مشغول ہے۔

آپؒ کے زمانے کی روئدادوں میں جب مدرّسین وملازمین اور ذمہ داروں کی فہرست شائع ہوتی اور ہر نام کے آگے اس کا عہدہ ومنصب لکھا ہوتا، تو ہم

یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ جس کی محنت وجاں فشانی اور جس کے مال ومنال کی قربانی سے یہ چمن لہلہا رہا ہے، وہ اپنے نام کے آگے اپنی ذمہ داری درج کرتا ہے تو ان الفاظ میں: ''مدرسہ کے سب کام کرنا میری ذمہ داری ہے''۔

مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ اسی کی تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: عام طور پر روئیدادیں جو تیار کی جاتی ہیں اس میں طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے بڑے عہدے والوں کے نام لکھے جاتے ہیں، ایک طرف نام اور دوسری طرف منصب وذمہ داری لکھی جاتی ہے، مثلاً: مہتمم صاحب، شیخ الحدیث صاحب، مدرس صاحب، مدرسِ فارسی، عربی، اردو وغیرہ، اس کے بعد مدرسے میں خدمت کرنے والے ملازمین کے نام لکھے جاتے ہیں، پھر بھنگیوں کے نام لکھے جاتے ہیں۔ میں نے ایک رپورٹ میں دیکھا کہ سرِفہرست صدر مدرس کا نام، اس کے بعد دیگر مدرسین کا نام، اس کے بعد مدرسہ میں خدمت کرنے والوں کا نام ہے، اس کے بعد بھنگی کا نام ہے اور سب سے اخیر میں مولانا احمد حسن بھامؒ کا نام ہے اور کیفیت کے خانہ میں لکھا ہے: ''مدرسہ کے سب کام کرنا میرا فرضِ منصبی ہے''۔ آپ اندازہ لگائیے کہ رپورٹ ایک آدمی نہیں پڑھتا تھا، یہاں گجرات تک محدود نہیں رہتی تھی؛ بلکہ یوپی وغیرہ بھی جاتی تھی، یہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کے دل میں تواضع ہو۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۴۵، ۴۶)

ذرا سوچیے تو سہی! کہ ''سب کام'' کے الفاظ کی عمومیت میں کیا کیا داخل

ہے! اور صرف یہ لکھ کر شائع کر دینے تک محدود نہ تھا؛ بلکہ عمل کے میدان میں بھی بالکل کھرا اترنا آپ کی عادتِ شریفہ تھی۔

آپؒ کی تواضع کا دوسرا نمونہ بیان کرتے ہوئے حضرت مفتی عبد القیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ فرماتے ہیں: مولانا بھامؒ انتہائی سادہ اور متواضع انسان تھے، ان کی تحریریں میرے سامنے ہیں، اس میں ایک جگہ روئیداد میں تحریر فرماتے ہیں:

''میری گزارش: برادرانِ اسلام کی خدمت میں عاجزانہ درخواست ہے کہ اس رپورٹ میں مجھ سے کہیں کوئی خطا اور لغزش ہوئی ہو، یا میری کوئی لغزش اور خطا افواہاً کسی تک پہنچی ہو تو مجھ کو متنبہ فرما کر ممنون فرمائیں، سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے بلا تحقیق وسند دینی کام کو نقصان پہنچا کر اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے جیسی کوئی حرکت نہ فرمائیں''۔

اس کے بعد کیا فرماتے ہیں؟ غور سے پڑھیے!!

''میں آپ تمام کا کلّی ماتحت اور فرماں بردار ہوں، مدرسہ کی خیر خواہی اور بھلائی کے لیے جو کچھ کہا جائے گا اس پر عمل کروں گا، اور آپ کی فرماں برداری کروں گا''۔

یہ وہ شخص لکھ رہا ہے جس نے جامعہ بنایا، جس کی محبوبیت اور مقبولیت دونوں بستیوں میں تھی؛ بلکہ دوسری بستیوں میں بھی تھی۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۴۴)

لسانِ جامعہ حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ فرماتے ہیں: ایک اور اہم بات یہ کہ جو آدمی مہتمم، وہی آدمی چندہ کرنے بھی جائے اور چندہ بھی کیسا! دو تھیلے بغل میں دبا کر نکل جاتے، ایک میں چاول جمع کرتے اور دوسرے میں آٹا جمع کرتے۔ یہ عجیب وغریب انسان تھے۔ باقی آج کل جب بھی لفظِ ''مہتمم'' سنائی دیتا ہے تو شاندار عمارت، خوبصورت مکان، بہترین گاڑیاں اور حشم وخدم؛ یہ سب چیزیں ہمارے تصور میں آتی ہیں، الّا ماشاءاللہ۔ ادھر بانیٔ جامعہ کو دیکھیے: خود مہتمم، خود منتظم، خود بانی اور خود ہی چندہ کرنے والے! جامعہ کے ہر کام کو وہ اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۶۸، بتغیر یسیر)

حضرت مولانا فضلی مشہدیؒ (رفیقِ بانیٔ مرحوم) اپنے شعر میں اسی کو یوں بیان کرتے ہیں:

نام تھا احمد حسن اور بھام تھا جن کا لقب
قوم کے پیچھے کھپایا جس نے اپنا جان وتن

رجوع الی اللہ وانابت

انسان اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ شانہ کا محتاج ہے، اور ہم دیکھتے ہیں اور ہمارا یقین بھی ہے کہ جب تک خدائی نصرت شاملِ حال نہ ہو انسان بے بس ومجبور نظر آتا ہے۔ بانیٔ مرحوم کو دیکھیے! نامساعد حالات ہیں، سرمایہ کچھ بھی نہیں ہے، لوگوں کی طعن وتشنیع ہیں، ان سب کے باوجود میدان میں کود پڑے، اور اپنے اللہ

سے وہ سب کچھ منوالیا جو آپ چاہتے تھے، کیا یہ ایک غفلت شعار انسان کے بس کی بات ہوسکتی ہے! ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ آپ رجوع الی اللہ کے میدان کے بھی شہسوار تھے۔

آپ کی اس کیفیت کو دیکھ کر ذہن میدانِ بدر کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ بے انتہا نامساعد حالات ہیں، اللہ کا لاڈلا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی پوری رات آہ وزاری میں گزارتا ہے، اپنے رب کو مناتا ہے، کسی لمحہ چین نہیں ہے؛ حتیٰ کہ زبانِ مبارک سے نکلتا ہے: ''اللھم أنشدک عھدک ووعدک اللھم إن شئت لم تعبد بعد الیوم'' اے اللہ! آپ نے جو وعدہ اور عہد کیا ہے، میں آپ سے اس کے پورا ہونے کی درخواست کرتا ہوں۔ اے اللہ! اگر آپ اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کرنا چاہیں تو اس روئے زمین پر آج کے بعد آپ کی عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔ (بخاری: ۲۹۱۵) صدیق اکبر آگے بڑھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دستِ مبارک پکڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ''حسبک یا رسول اللّٰہ'' بس کیجیے اللہ کے رسول! آپ نے بہت آہ وزاری کرلی۔ (بخاری، کتاب الجہاد، ۲/ ۴۰۸) جب مقتدا کا یہ حال ہے تو ہمارے بانیٔ مرحوم- جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ادنیٰ سے مقتدی ہیں- پر اس کا عکس کیوں نہیں پڑسکتا ہے!!!۔

صلاح وتقویٰ

جس دین کی آبیاری کی خاطر آپ زندگی بھر تگ ودَو کرتے رہے، بھلا

کیا آپ کی زندگی اس دین سے خالی ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں! آپ کی زندگی میں دینِ اسلام پورے رسوخ کے ساتھ داخل ہو چکا تھا، آپ کو بچپن سے صلحا وعلما کی زیارت میسر تھی، بچپن میں جن استاذ سے آپ نے مکتبی تعلیم حاصل کی (مولانا امیر الدین سملکیؒ) وہ بھی اپنے زمانے کے صلحا کا مرجع تھے، نیز آپ کے اساتذہ کی فہرست بتا رہی ہے کہ نیک سیرت اور صلاح پسند مزاج نے ان حضرات کا انتخاب کیوں کیا ہوگا! اسی لیے صالحیت وتقویٰ آپ کا مزاج بن چکے تھے۔ معاملات کی صفائی اور خرچ کا پورا ریکارڈ محفوظ رکھنا آپ کے انتہائی متقی وپرہیزگار ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اعلیٰ ترین اوصاف جس کسی کو ملے ہیں وہ تقویٰ ہی کا تو اثر ہوتے ہیں، پھر آپ کے کاموں کا یکے بعد دیگرے بنتے چلے جانا بھی بتا رہا ہے کہ آپ "ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب، ومن یتوکّل علی اللّٰہ فھو حسبہ" [اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا، اللہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کردے گا۔ اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا کرے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس (کا کام بنانے) کے لیے کافی ہے] کا مصداق بن چکے تھے۔

حضرت قاری محمد یامین صاحبؒ اس وصف کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

منیف نبیل بارع متورع		حریص علی الطاعات للہ صارم

ترجمہ: آپؒ بلند مرتبہ، شریف، باکمال، پرہیزگار، اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے بے انتہا خواہش منداور بہادر تھے۔

دنیا سے بے رغبتی

پہلے گذر چکا ہے کہ آپ نے مدرسے کی خاطر اہلیہ محترمہ کے زیورات تک فروخت کردیے تھے، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ کے دل میں دنیا کی محبت نام کو بھی نہ تھی۔

ماہنامہ ''الدین'' کی مقبولیت کو دیکھ کر لوگ اس کے ذریعہ دنیا کمانے کی ترغیب دیتے اور کوئی اپنا کاروبار چمکانے کے لیے اشتہار کے نام پر روپیوں پیسوں کی پیش کش بھی کرتا؛ مگر جس کی نظر خالقِ کائنات کے خزانوں پر ہو، وہ کیوں کر ان ٹھیکروں کی طرف آنکھ اٹھا سکتا ہے؛ لہٰذا انتہائی غربت وافلاس کے عالم میں آپ اس پیش کش کو کس انداز میں اور کیا کہہ کر ٹھکرایا کرتے تھے؟ اس کے لیے پڑھیے مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب مدظلہ کا بیان:

اُس غربت کے زمانے میں بعض لوگوں نے مولانا سے کہا کہ: آپ کا رسالہ ''الدین'' نکلتا ہے، اس میں بے شمار لوگوں کے تبصرے؛ بمبئی تک کے اخبارات کے تبصرے شائع ہوتے ہیں، آپ ''الدین'' سے جہاں دینی نشر واشاعت کا کام کرتے ہیں اور اس میں دینی امور چھاپتے ہیں، تو ایک آدھ مضمون میں کسی کارخانے کی ایڈورٹائزیا کوئی اور دنیوی چیز چھاپ دیا کریں؛ تاکہ آپ کے لیے

کچھ مدرسے کی آمدنی کا ذریعہ بنے، تو مولانا نے اس پر مستقل مضمون لکھا اور یہ لکھا کہ: ''بھائیو! لے دے کر پورے علاقے میں دین کے نام پر صرف ایک رسالہ نکالتے ہیں، اس کو بھی آپ دنیا کے لیے بنانا چاہتے ہیں، اگر اس طرح کی چیزیں شائع کرنی ہیں تو دوسرے، بہت سے رسالے موجود ہیں، آپ اس سے دنیوی منافع حاصل کریں، میرا یہ رسالہ تو خالص دین کے لیے ہے''۔ (بانیٔ جامعہ نمبر:۹۹)

دین سے لگاؤ

بانیٔ مرحوم کی پوری زندگی دین کی خدمت، اس کی تحصیل، اس پر عمل، اس کی نشر واشاعت میں گذری، پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو کام کے مواقع عطا فرمائے تو آپ نے تین اہم سلسلے دین پھیلانے اور زندگی میں اتارنے کے جاری فرمائے: ایک مدرسہ، دوسرا: ماہنامہ، تیسرا: مطبع (پریس)۔ آپ کو دین کے ساتھ لگاؤ اور انسیت جس والہانہ اور فدا کارانہ طور پر تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ آپ نے مدرسہ کا نام ''تعلیم الدین''، رسالہ کا نام ''الدین'' اور پریس کا نام ''معین الدین'' رکھا، یعنی اپنی ہر کدّ وکاوش کو ''دین'' سے جوڑ دیا، اور اپنے نام، نسبت اور خاندان کو ذرہ برابر خاطر میں نہ لائے، جب کہ دیکھا جاتا ہے کہ عموماً لوگ ایسے مواقع میں نام رکھنے کے لیے اپنی ذات، خاندان یا خاندان کے بزرگوں کو یاد کرتے ہیں؛ مگر یہاں تو رنگ ہی کچھ اور تھا، آپ ''قل إن صلاتی ونسکي ومحیاي ومماتي لله رب العالمین'' کا حقیقی پرتَو تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب لوگوں نے ماہنامہ ''الدین'' میں اشتہار دے کر دنیا کمانے کی ترغیب دی تو آپ کا جواب تھا کہ: اس کام کے لیے تو بہت سے رسائل و اخبارات مل جائیں گے میرے اس رسالے کو خالص دین کے لیے رہنے دو۔

سادگی

حدیث شریف میں آتا ہے کہ: إن البذاذة من الإیمان. (ابوداؤد: ۴۱۶۱)
سادگی ایمان کا جزو ہے۔ بانیٔ مرحوم کی گفتار ورفتار، رہن سہن، نشست و برخاست غرض ہر ہر ادا میں اس کی جھلک نظر آتی تھی، چناں چہ آپ کی تحریریں ہوں یا بیانات، ان میں یہ وصف بہ درجۂ اتم پایا جاتا ہے۔

چنانچہ افتتاحِ مدرسہ کے وقت کی حالت کو بیان کرتے ہوئے آپؒ نے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں اُنھیں دیکھیے: ''اپنے مدرسہ کی بِنا ۱۳۲۶ھ میں اس حال میں ہوئی کہ اس وقت مجھ خادم احمد حسن اور قرآن شریف کے ایک مدرّس کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا''۔

آپؒ کے قلم سے یہ الفاظ محض ادائیگیٔ رسم کے طور پر صادر نہ ہوئے تھے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ بانیٔ مرحوم اپنے گفتار وکردار میں بالکل یکساں نظر آرہے ہیں، بھلا اس سادگی کو کوئی ہمارے دورِ قحط الرجال میں اپنائے تو سہی! دراصل یہی وہ زندگی ہے جس کو تکلف سے پاک کہا جاسکتا ہے، اس کے اعلیٰ ترین نمونے دیکھنے ہوں تو حضرات صحابہؓ کی زندگی پر نظر ڈالیے، بانیٔ مرحوم بھی آخر ان ہی کے نام لیوا

اور والہ وشیدا تھے۔

حضرت مولانا فضلی مشہدیؒ اپنا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان فرماتے ہیں:

سادگی سے تھے ملبس، تھے تصنع سے بری
ان کے جیسے اَور کم دیکھے گئے اہلِ زَمن

یہی سادگی آپ کی اولاد میں آج بھی پائی جاتی ہے۔ حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ کا بیان ہے: بانیٔ جامعہ مرحوم کے دیکھنے والے اور دیکھنے والوں کے دیکھنے والے بھی ملنا اب تو مشکل ہے؛ لیکن ان کے خاندان کے جن افراد کو ہم نے دیکھا، تو ان کی سادگی اور بھولے پن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہ اتنے بھولے بھالے سیدھے سادے ہیں تو بانیٔ جامعہ کتنے بھولے بھالے سیدھے سادے ہوں گے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۶۴)

اسی سادگی کا اثر آج ہم اپنی آنکھوں سے آپ کے مزارِ اقدس پر بھی دیکھ سکتے ہیں، کہ اس قدر رفیع المرتبت ہستی کی آرام گاہ مسلمانوں کے ایک ایسے عام قبرستان میں واقع ہے جہاں ہر وقت حاضری بھی آسان نہیں، قبر پر نہ کوئی پتھر کی تختی ہے نہ کوئی عظیم الشان کتبہ، صرف ٹین کے ایک ٹکڑے پر سادہ انداز میں آپ کا نام لکھا ہوا۔

معاملات کی صفائی

دین کے شعبہائے خمسہ میں معاملات کا شعبہ وہ ہے جہاں اچھے اچھوں

کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، آپ اس میدان میں بھی شہسوار تھے، ظاہر ہے جس کے دل سے دنیا رخصت ہو چکی ہو وہ بھلا اس میں سستی کرے تو کیوں کر! اس لیے کہ معاملات کی آلودگیاں عموماً حبِّ دنیا کا اثر ہوا کرتی ہیں۔

''بانیٔ جامعہ نمبر'' میں ''الدین'' کے ایک شمارے کے حوالے سے لکھا ہے: (آپ کی) ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جہاں ''الدین'' میں اور باتیں لکھتے تھے وہیں جامعہ کے حسابات بھی ایک دَم صاف صاف لکھتے تھے، مثلاً: جلسے میں دعوت کے اتنے روپیے ہوئے، کتابوں کے انعام میں اتنے ہوئے، تنخواہوں میں اتنے صرف ہوئے؛ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسابات اور مالی معاملات کے اندر بانیٔ جامعہ کتنے صاف ستھرے، حساس اور محتاط تھے۔ یہ چیز آج کل دینی اداروں کے لیے بہت ضروری ہے، کہ مدرسے کے معاملات ایسے صاف ستھرے ہوں کہ کسی دوسرے کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۶۵)

ہمت واستقلال

بانیٔ مرحوم عزم واستقلال کے پہاڑ تھے، بڑی سے بڑی رکاوٹ آپ کے ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکتی تھی، جس کام کا عزم فرماتے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیتے تھے، یقیناً جو عزم وحوصلہ اور بلند ہمتی آپ کو میسر تھی وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ بے سروسامانی کے عالم میں نامساعد حالات جھیلتے ہوئے پریس کا اجرا فرمایا، مخالفتوں کے طوفان میں چھوٹے سے مدرسے کے لیے بڑی زمین خریدی

اور بہ قدرِ ضرورت عمارتوں کی تعمیر فرمائی، اپنے چھوٹے سے مدرسے میں تجوید، خوش نویسی وغیرہ شعبہ جات قائم فرمائے اور یہ سارے امور سرمائے کے فقدان کے زمانے میں اتنے حسن وخوبی سے انجام دیے کہ دنیا ششدر وانگشت بدنداں رہ گئی۔ اسی پر بس نہیں، عالمی جنگِ عظیم کے زمانے میں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے افریقہ پہنچنا کس قدر شجاعت و پامردی اور عزم وہمت پر دلالت کرتا ہے، خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ کشتیوں اور جہازوں میں آج کی طرح سہولیات بھی فراہم نہ تھیں۔

آپ کی اس بلند ہمتی کو سلامی پیش کرتے ہوئے قاری محمد یامین صاحب گویا ہیں:

یھون علیٰ عبد منیب مصمم
أمور صعاب لا ترام لرائم

ترجمہ: (اللہ سے) لو لگانے والے باعزیمت بندے کے لیے ایسے مشکل کام آسان ہوجاتے ہیں جن کا قصد ہر کس وناکس نہیں کرسکتا۔

حضرت مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ اس کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: آپؒ کی بلند ہمت اور برکت سے آج صرف یہی موضع (ڈابھیل سملک ہی) نہیں؛ بلکہ پورا صوبۂ گجرات (آپ کے قائم کردہ) جامعہ کی برکت سے دور دراز ملکوں میں مشہور ومعروف ہوگیا ہے۔ (ذکرِ صالحین: ۲/۳۹۷)

صبر وتحمل

حضرات انبیاء علیہم السلام کو جن مقاصد کی تکمیل کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ مقاصد صبر وتحمل کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے، خود ہمارے آقا ومولیٰ سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی دیکھ لیجیے: مکّی زندگی ہو یا مدنی، ہر جگہ اور ہر وقت یہ صفت جلوہ گر اور کارفرما نظر آتی ہے۔ بانیٔ مرحوم نے بھی آخر مقتدا کی حیثیت سے حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذات کو اپنایا تھا؛ اس لیے آپؒ میں بھی یہ صفت بہ درجۂ اتم موجود تھی۔

دیکھیے! طلب علمی کا زمانہ کس صبر وتحمل سے گزارا، پھر مدرسہ کے لیے زمین خریدی اور اعتراضات ہونے لگے تو کس خندہ پیشانی سے اس کو برداشت کیا، اور معترضین کی ناسمجھی اور کم فہمی کی وجہ سے ان کے درپے سنہ ہوئے؛ بلکہ ''قالوا سلاما'' کے قرآنی فرمان کو اپنا اسوہ بنایا، سفرِ افریقہ کے دوران پیش آمدہ مصائب کو بھی نعمتِ خداوندی سمجھ کر برداشت کر گئے۔ یہ اور اسی قسم کے بے شمار واقعات ہوں گے جن میں یہ رنگ جلوہ گر ہوتا تھا، کاش! تاریخ مزید واقعات کو ہمارے سامنے پیش کرتی تو صبر وتحمل کے نمونے ہمیں اسوہ کے طور پر میسر ہوتے۔

ایثار وقربانی

قربانی کے بغیر دین کی خدمت کا تصور جاگنے میں خواب دیکھنے کے مترادف ہے، تن آسانی اور راحت وآرام کے ساتھ نہ آج تک دین کی خدمت

ہوئی ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ بانیٔ مرحوم کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی حیاتِ مستعار کا ہر لمحہ قربانی سے عبارت تھا، آپ کی ہر سانس ایثار کی ایک داستان ہے، جانی و مالی قربانی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس میں بانیٔ مرحوم نے اپنا حصہ نہ لگایا ہو۔ اپنے گھر سے قربانی کا آغاز کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت رہی ہے، بانیٔ مرحوم بھلا اس سنت پر عمل کرنے سے کیوں چوکتے، مدرسہ کی ابتدا ہوئی تو پہلے خود اپنے گھر کی قربانی دی، پھر ضرورت پڑنے پر قوم سے چندہ مانگا۔ رقوم کی ضرورت پڑی تو پہلے اپنی زوجۂ محترمہ کے وہ زیورات- جن کے بل بوتے پر آپؒ دنیا بھر کے خزانے جمع کر سکتے تھے- کو آخرت کے خزانے میں جمع کروا کر اپنی جان کی طرح اپنے مال کو بھی راہِ خدا میں قربان کر دیا، پھر کہیں جا کر قوم سے تعاون کی اپیل کی۔ پتھر کھائے، گالیاں سنیں، طعنے برداشت کیے، طلبہ کی خاطر لمبے لمبے اسفار کیے، مصائب وآلام جھیلے؛ غرض کیا کیا قربانیاں نہ دیں! اور غضب تو دیکھیے کہ جب ان قربانیوں کے پھل کھانے کا موقع آیا تو چپکے سے اپنے اس پروردگار کے پاس چلے گئے جو روزِ جزا کا مالک اور بندوں کی محنتوں کا شاکر ہے۔ ما اسئلکم علیه من اجر، ان اجری الّا علیٰ ربّ العالمین۔ (الشعراء)

معاد کے ساتھ معاش کی بھی فکر

بانیٔ مرحوم اپنی قوم کو جو افراد دینا چاہتے تھے ان کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی فنون سے بھی آراستہ کرنا چاہتے تھے؛ تاکہ خالص دینی ذہن رکھنے

والے افراد اور سرکاری ملازم امت کو مل سکیں جو دین داری اور شریعت کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے حکومتی ذمہ داریوں کو نبھا سکیں اور یہ دنیوی مشاغل انھیں آخرت کی یاد سے غافل نہ کر پائیں؛ بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر وہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آئیں، جس کی وجہ سے برادرانِ وطن بھی اسلام کی جیتی جاگتی تصویر سے روشناس ہوسکیں؛ اس لیے اپنے مدرسے میں عصری علوم کے اتنے درجات بھی قائم کردیے جن کی بنیاد پر سرکاری عہدہ حاصل کیا جاسکتا تھا۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ رقم فرماتے ہیں: ''مولانا احمد حسن بھامؒ کی ایک خدمت یہ بھی ہے کہ: انھوں نے دین کی تعلیم کے ساتھ دنیا کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری کیا، اس وقت چھ (کلاس) تک اسکول پڑھنے سے سرکاری نوکری مل جاتی تھی، مولانا نے مدرسے میں باقاعدہ اسکولوں کی کلاسیں جاری کی تھیں۔ خود مولانا نے ایک موقع سے لکھا ہے: ہمارے مدرسے کی تعلیم کا یہ حال ہوگیا ہے کہ یہاں کا فارغ یعنی دنیوی تعلیم حاصل کردہ شخص کسی سرکاری عہدے کے لیے درخواست دیتا ہے تو اس کی درخواست قبول کی جاتی ہے''۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۰۹)

اوقات کی حفاظت

وقت انسان کا بیش قیمت سرمایہ ہے، اس کا صحیح استعمال انسان کو کامیابی کی منزلیں طے کرادیتا ہے، اور اس کے غلط استعمال سے انسان ذلت وخسران کا

شکار ہو جاتا ہے، ہم بانیٔ مرحوم کی زندگی کا کل وقفہ ۴۰/ یا ۴۱/سال سے زیادہ نہیں پاتے؛ مگر آپ کی گوناگوں خدمات اور بے مثال صفات کو دیکھتے ہوئے یہی ذہن میں آتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کی قدر کی تھی۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

حضرت کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں آپ سن رہے تھے، اکتیس سال کی عمر میں: بالکل کھلتی جوانی میں جامعہ کی بنیاد رکھی اور اس پر یہ اخلاص! بڑے بڑے مشائخ کی خدمت وصحبت میں طویل طویل عرصہ رہنے کے بعد جو خلوص انسان حاصل کرسکتا ہے، وہ اکتیس سال کے اس خوبرو نوجوان کو حاصل تھا، جس کے اخلاص کا عظیم تاج محل جامعہ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور حیرت ہے کہ اکتالیس سال کی عمر میں تو وفات بھی ہوگئی، اتنی کم عمری میں کیسے عظیم الشان کام کر گئے! وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے اخلاص کے ساتھ زندگی کی ایک ایک گھڑی کی قدر کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنی زندگی کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔ (بانیٔ جامعہ نمبر:۶۶)

دوراندیشی (قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید)

حدیث میں مؤمن کا ایک اہم وصف بیان کیا گیا ہے، اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله (سنن الترمذی:۳۱۲۷) مومن کی فراست سے ڈرو؛ اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ بانیٔ مرحوم اس وصف سے بھی مالا مال تھے، آپ جن

محنتوں اور کوششوں میں اپنی حیاتِ مستعار کے قیمتی اوقات صرف فرمارہے تھے، ان کے نتائج کا بھی اپنے دل کی آنکھوں سے اسی وقت مشاہدہ فرمارہے تھے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ غزوۂ خندق کے موقع پر کسمپرسی کی حالت میں تھے، خندق کی کھدائی کے دوران ایک چٹان نے رکاوٹ پیدا کردی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور اپنے دستِ مبارک سے کدال چلائی، ایک چمک اٹھی، بس پھر کیا تھا! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فراستِ ایمانی نے دیکھا کہ فقر اور تہی دستوں کی جماعت قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج کو اپنے قدموں تلے روندرہی تھی اور ان سپر پاور حکومتوں کے خزانے اس کی ٹھوکر میں پڑے تھے۔

(سیرت احمد مجتبیٰ: ۲/ ۳۸۵، ۳۸۶)

آقا کی اگر یہ کیفیت ہوسکتی ہے تو اسی کے مشکاۃِ نبوت سے روشنی حاصل کرنے والا ایک ادنیٰ غلام کیونکر اس سے محروم رہ سکتا ہے؟ چناں چہ بانیٔ مرحوم کی نگاہیں جو دیکھ رہی تھیں اسی کو ایک رپورٹ میں یوں درج فرماتے ہیں: میرے اس ''تعلیم الدین'' پر ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ یہاں سے مفتیانِ کرام نکلیں گے، یہاں سے قرائے کرام نکلیں گے، یہاں سے لوگوں میں فیصلہ کرنے والے قاضی نکلیں گے، یہاں سے قوم کو ماسٹر ملیں گے۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۴۸)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: میرے اِس مدرسے پر ایک وقت وہ آنے والا ہے کہ یہاں سے لوگ سند حاصل کریں گے اور بڑی بڑی جماعتیں یہاں سے

فارغ ہوں گی۔ حالاں کہ اُس زمانے میں اِس کا تصور بھی نہیں تھا، ان کی یہ بات ہو بہ ہو اور حرف بہ حرف صادق آئی۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۱۰)

بانیٔ مرحوم وہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جو حضرت مولانا احمد بزرگؒ نے تحریر فرمایا ہے: ہمارے علاقے میں جب کوئی جھگڑا ہوتا تھا تو انصاف کرنے کے لیے اگر کسی عالم کو بلانا ہو تو یوپی جانا پڑتا اور ان سے درخواست کرنی پڑتی اور پھر ان کو وہاں سے یہاں بلانا پڑتا اور پھر وہ انصاف اور شرعی فیصلہ کرتے تھے، آج خود ہمارے مدرسے میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو شریعت کی روشنی میں فیصلہ کرتے ہیں۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۱۰۹، ۱۱۰)

آج بانیٔ مرحوم کی فراستِ ایمانی کا ثمرہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، ان کی صداقت ثابت کرنے کے لیے آج کسی دلیل کی ضرورت باقی نہ رہی، کھیپ کی کھیپ تیار ہو کر مسلمانانِ عالم کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔

حضرت مفتی اسمٰعیل صاحب بسم اللہؒ کی اہلیہ محترمہؒ کے سامنے جو پیشین گوئی فرمائی تھی کہ میرے اس مدرسے میں ولایت وناتال (بالفاظِ دیگر اطرافِ عالم) سے طلبہ پڑھنے آئیں گے، آج تو خیر اس کی صداقت میں کوئی شک ہی نہ رہا، آپ کی یہ شاگردہ رشیدہ اپنے زمانے میں فرماتی ہیں: میری آنکھوں نے دیکھا کہ افریقہ اور انگلینڈ کے کتنے بچے یہاں پڑھ رہے ہیں۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۷۶)

گویا چند ہی سالوں بعد آپ کی یہ پیشین گوئی کھل کر سامنے آئی اور آپ

''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' کا مصداق بن گئے۔

باطل کی سرکوبی کی فکر

آپ کی فکروں کا دائرہ صرف اشاعتِ علم اور تبلیغِ دین تک ہی محدود نہ تھا؛ بلکہ زمانے کے حالات، فتنوں اور ان سے نمٹنے کی سعی وکوشش بھی آپ کے افکار واعمال کا ایک حصہ تھا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ ''الدین'' کے ذریعہ آپ نے کس طرح ترویجِ عیسائیت کی کوششوں پر قدغن لگائی، حالاں کہ اس فتنے کے تعلق سے انگریزی دور میں زبان کھولنا حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کے مترادف تھا، آپؒ کی یہ کوششیں کارگر ہوئیں، اور کتنے مسلمان اس شر سے محفوظ ہو گئے، اور کتنے مرتد دوبارہ داخلِ اسلام ہوئے!

اندازہ کیجیے عزم وہمت کے اس پہاڑ کا، اور غور کیجیے بے باکی وجرأت کے اس اتھاہ سمندر کا، ایک ظالم حکومت کی موجودگی میں اس کے مشن کے خلاف آواز اٹھائی جارہی ہے، آپ کی اس آواز کو کوئی طاقت دبا نہ سکی اور بلاخوفِ لومۃ لائم اپنا کام کرتے رہے۔

قاری محمد یامین صاحبؒ فرماتے ہیں:

كذي منصب التجديد أمضىٰ عزيمةً		فما خاف غير الحق لومة لائم

ترجمہ: آپ منصبِ تجدید پر فائز عزم واستقلال کے ساتھ کر گذرنے والے شخص کی طرح تھے، چناں چہ آپ خدا کے سوا کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے تھے۔

آپ کی ان صفات کے اصل سرچشمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مفتی عباس بسم اللہ صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں: صحیح وقت پر فتنوں کا تعاقب کرنا، اس کا مقابلہ کرنا اور وقت کے باطل کی جیسی طاقت ہے اسی طاقت کے ساتھ اس کو دفع کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فراست کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔

(بانیٔ جامعہ نمبر: ۸۴)

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس فراستِ ایمانی کا شمّہ نصیب فرمائے۔ آمین

بہرحال آپؒ کی پوری زندگی شریعتِ مطہرہ اور ملتِ بیضاء کی صیانت وحفاظت میں صرف ہوئی، اور اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں فرمایا۔

حضرت قاری محمد یامین صاحبؒ فرماتے ہیں:

حمی الملة البيضاء في طول عمره		ولم يأل جهدا في احتمال العظائم

ترجمہ: زندگی بھر روشن ملت (اسلام) کی حفاظت کرتے رہے اور بڑے سے بڑے کام کے انجام دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

جہدِ مسلسل وسعیٔ پیہم

بانیٔ مرحوم جہاں ایک طرف اپنے اوقات کو تول تول کر استعمال کرتے تھے وہیں جسمانی کسل وسستی کو بھی اپنے پاس بھٹکنے نہ دیتے تھے۔ ایک کام سے فارغ ہوئے نہیں کہ دوسرا کام تیار رہتا تھا، یہی نہیں؛ بلکہ ایک کام کے ساتھ کئی کئی

کام انجام دینا اور درمیان میں آرام کا خیال تک نہ لانا، آپ کا امتیازی وصف تھا۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ماہنامہ ''الدین'' جاری فرمایا، پھر جب ایک عارض پیش آیا جس کی وجہ سے ''الدین'' کی اشاعت موقوف ہوگئی تو اس عارض کو خاطر میں نہیں لائے؛ بلکہ فوراً پریس کھول کر اپنا کام نکال لیا۔ اسی طرح افریقہ تشریف لے گئے، مقصد تو تھا مدرسے کے لیے سرمایہ فراہم کرنا؛ مگر ساتھ ہی مصالحت بین المسلمین کا فریضہ بھی انجام دیا، اتنا ہی نہیں، ایک مسجد اور مدرسہ کی بنیاد بھی سرزمینِ افریقہ میں ڈال دی، اسی جہدِ مسلسل نے آپ سے وہ سب کچھ کروالیا جو ہماری کسل مند طبیعتوں کے لیے مشکل ہی نہیں، ناممکن سا لگتا ہے۔

حسنِ انتظام

آپؒ کے کارناموں کی فہرست اور ان کی کامیابی و پذیرائی کو دیکھ کر آپ کے حسنِ تدبّر اور قوتِ نظم ونسق کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ قلیل مدّت میں مدرسہ نے عظیم الشان ترقی کی، اور امیدوں سے بڑھ کر کارہائے نمایاں انجام دیے۔ تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل کے حل کے لیے گھر گھر ہنڈیاں رکھوائیں، جس سے ایک طرف طلبہ کے خورد ونوش کا مسئلہ حل ہوا تو دوسری طرف گاؤں والوں پر بھی اپنی وسعت سے زیادہ بوجھ نہ آیا، مدرسہ کے قوانین طے کرنے کی نوبت آئی تو خودرائی کے بہ جائے اٹھائیس گاؤں کے سرکردہ حضرات کو -جن میں علما بھی شریک رہے ہوں گے- جمع فرما کر ان کی آرا ومشوروں سے بھی

خوب استفادہ کیا۔

آپ کے حسنِ انتظام کی ایک اور جھلک حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ کے قلم سے پڑھیے: لکھتے ہیں: تہذیب کا خیال خصوصیت سے اس مدرسے کے منتظمین کو ہے جس سے طلبا کے اخلاق نہایت عمدہ نظر آتے ہیں۔

(نقوشِ بزرگاں ۱/ ۶۸)

مقبولیت

دنیا کا مشاہدہ ہے کہ انسان ابتدا میں مشقتیں اٹھاتا ہے اور قربانیاں دیتا ہے تو انتہا میں اسے اس کا پھل اور نتیجہ حاصل ہو ہی جاتا ہے، بانیٔ مرحوم کی پوری زندگی جہد واخلاص اور ایثار وقربانی میں گذری، دوسروں کی خاطر تڑپتے اور غم کھاتے گذری، جس کا لازمی نتیجہ ''الانسان عبدالاحسان'' (احسان کرنے کے نتیجے میں انسان غلام بن جاتا ہے) کے بہ موجب یہی ہونا تھا کہ آپؒ عنداللہ وعندالناس مقبولیت کا تمغہ پاتے، چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ افریقہ کی سرزمین جو نہ جانے کتنے عرصے سے مسلمانوں کے درمیان نفرت وانتشار کا ماحول دیکھ رہی تھی، بانیٔ مرحوم کی ہر دل عزیز شخصیت نے دیکھتے دیکھتے اس جھلستی آگ کو ٹھنڈا کر کے محبت والفت کا چمنستان بنا دیا۔ آپؒ کی وفات پر علمائے افریقہ نے جوق در جوق تشریف لا کر اہلِ خانہ کو دلاسا دیا، بچوں کے سروں پر دستِ شفقت رکھا، آپؒ کے کارناموں کو سراہا۔ یہی نہیں، آپ کے وطن سملک ڈابھیل کے باشندے- جو چند

سال پہلے آپؒ کے سامنے بے باکی سے اعتراض کرتے تھے، طعنے دیتے اور پتھر مارتے تھے- آپؒ کی وفات کی خبر سن کر سراپا رنج والم بن گئے۔ اوران کی اولاد نے آپ کے جاری کردہ چشمۂ علم سے سیرابی حاصل کی۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: مولانا کو جنہوں نے ستایا، اللہ کے اس بندے نے اُس وقت ان کو بددعا دینے کے بجائے ان کے لیے، ان کی اولاد کے لیے دعائیں کیں۔ چنانچہ ان لوگوں کی نسل میں بھی ایسے لوگ آئے جنہوں نے مولانا کے چشمے سے پیا، اللہ تعالیٰ نے حالات ہی بدل دیے۔

(بانیٔ جامعہ نمبر: ۸۵)

اپنے وقت کے ایک مؤقر عالمِ دین حضرت اقدس مولانا محمد سعید بزرگؒ (سابق مہتمم جامعہ) کے دل میں بانیٔ مرحوم کے تئیں محبت واحترام کے جو جذبات تھے ان کا اظہار کرتے ہوئے حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب مدظلہ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں: ان کی محبوبیت اور مقبولیت پر مجھے ایک قصہ یاد آ گیا، ہم جس زمانہ میں پڑھتے تھے وہ حضرت مولانا محمد سعید صاحب بزرگؒ کا دور تھا، مسجد میں سالانہ جلسہ ہو رہا تھا، یہاں کے ایک فاضل، قاری مولانا اشرف علی کوکنی جن کو دیکھنے والے بہت سارے حضرات موجود ہیں، انہوں نے جامعہ کے بارے میں ایک نظم پڑھی، جو حضرت مولانا واجد حسین صاحب دیوبندیؒ نے مرتّب فرمائی تھی، جب

وہ اس نظم کو پڑھتے ہوئے خاص اس کڑی پر پہنچے:

اس کا بانی احمد حسن کے نام سے مشہور تھا	سملک وڈا بھیل کے لوگوں کا وہ محبوب تھا

تو میں نے دیکھا حضرت مولانا محمد سعید بزرگؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور اپنے ہاتھ میں جو گھڑی تھی اسی وقت فوراً نکال کر ایک آدمی کے ذریعہ نظم پڑھنے والے کو دے دی۔ (بانیٔ جامعہ نمبر: ۴۴، ۴۵)

اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات ہوں گے جو آپ کی مقبولیت کا پتہ دیتے ہیں، ہمیں تو یہی نظر آتا ہے کہ حدیث شریف کا یہ مضمون آپ پر پورا صادق آیا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام سے ارشاد فرماتے ہیں کہ: مجھے فلاں شخص پسند ہے تم بھی اس سے محبت کرو، وہ خود محبت کرنے لگتے ہیں، اور آسمان پر آواز دیتے ہیں کہ فلاں بندہ اللہ کا پسندیدہ ہے تم سب اس سے محبت کرو، پس آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، اور پھر اس کے لیے زمین پر قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔ (مشکوۃ ۲/ ۴۲۵)

احمد نام کی جامعہ سے مناسبت

حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جن ناموں کا انتخاب ذاتی طور پر فرمایا گیا ہے ان میں ایک احمد بھی ہے، اسی نام کے واسطے سے بانیٔ مرحوم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک سچّے پکّے امتی اور متبع تھے، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۲۳ رسال کی قلیل مدت میں ایک انقلابِ عظیم برپا کیا تھا، اسی کا ایک ہلکا سا نقشہ بانیٔ مرحوم کی زندگی

میں نظر آتا ہے، چناں چہ آپؒ نے بھی انتہائی قلیل مدت میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیے جن کو پچھلے صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ آپؒ نے تقریباً اکتالیس سال عمر پائی تھی، اس میں بلوغ سے پہلے کے پندرہ سال اور قیامِ افریقہ کے تین سال منہا کر دیے جائیں تو تیئیس سال بچ جاتے ہیں، انہی تیئیس سال میں یہاں کی ساری خدمات ہیں، جس میں زمانۂ تعلیم بھی داخل ہے۔ (فافھم وتدبر)

خیر یہ تو ایک قیاسی نتیجہ ہے جس کو نکتے کے طور پر پیش کر دیا گیا؛ ورنہ قیامِ افریقہ کے تین سال بھی اہم ترین خدمات میں گذرے ہیں۔

اب اس مبارک نام کو جامعہ سے جو مناسبت ہے اس کو بھی ملاحظہ کیجیے:
خود بانیٔ مرحوم احمد (احمد حسن بھامؒ) ہیں، جن کے ہاتھوں سنگِ بنیاد رکھا گیا وہ بھی احمد (صوفی احمد میاں لاجپوریؒ) ہیں، سب سے پہلے مدرسِ جامعہ احمد (احمد درویشؒ) ہیں، جن کی کدوکاوش کے نتیجے میں ''مدرسہ'' ''جامعہ'' کے قالب میں ڈھلا وہ بھی احمد (احمد بزرگؒ) ہیں، اس طرح ''احامدِ اربعہ'' کے خون پسینے سے سیراب یہ چمن آج لہلہا رہا ہے۔

آج - جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں - جامعہ ''احامدِ ثلاثہ'' کے زیرِ سایہ اپنا سفر طے کر رہا ہے، دیکھیے: مسندِ اہتمام پر براجمان: حضرت مولانا احمد بزرگ ①

① سنا ہے کہ ''احمد آباد'' بھی چار احمد نامی بزرگوں کی برکت سے آباد ہوا تھا، اور اسی کی برکت ہے کہ دشمنانِ اسلام اپنی لاکھ کوششوں کے باوجود ملکی سطح پر اس کا نام بگاڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور نہ آئندہ ہو سکیں گے۔ ان شاء اللہ

دامت برکاتہم ہیں، مسندِ مشیخت پر فائز: حضرت الاستاذ مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم ہیں اور اس چمن کو تجوید وقراءات کے نغموں سے معمور کرنے والے: شیخ القراء حضرت مولانا قاری احمد اللہ صاحب بھاگل پوری دامت برکاتہم ہیں۔ خدا کرے تینوں بزرگوں کا سایۂ عاطفت تادیر ہمارے سروں پر قائم رہے، اور جس طرح طلبہ کے قافلے ''احامدِ اربعہ'' سے استفادہ کرتے تھے، اللہ ہم کم سوادوں کو بھی اپنے زمانے کے ''احامدِ ثلاثہ'' سے استفادے کی توفیق بخشے۔ آمین

بابِ سوم

اساتذہ، تلامذہ، خاندان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بانیٔ مرحوم کے اساتذہ

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان کی تعمیر وترقی میں اس کے اساتذہ کا کردار انتہائی اہم ہوتا ہے، جس طرح ماں باپ اپنی اولاد کی جسمانی پرورش میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں اسی طرح اساتذہ معنوی ترقی کا زینہ بنتے ہیں، اور یہ اصول صرف علومِ دینیہ کے ساتھ ہی خاص نہیں، دنیوی فنون میں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ اساتذہ کی سوچ اور فکر، ان کے مزاج ومذاق اور گفتار وکردار کا بہت بڑا اثر تلامذہ وشاگردان پر پڑتا ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ جس طالب علم کو صلاحیت مند اور عمدہ، متقی وپرہیزگار، مخلص وباخدا اساتذہ میسر ہوں اور اس نے ان کی قدردانی بھی کی ہو، تو یہی صفات غیر محسوس طریقے سے اس میں منتقل ہوتی ہیں؛ اسی لیے جہاں کسی شخصیت کا تذکرہ کیا جاتا ہے اس کے اساتذہ کا ذکر بھی ضمناً چلا آتا ہے، خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ چند سرپھروں کو اساتذہ کے واسطے کے بغیر محض اپنے ذاتی مطالعہ اور ستم بالائے ستم صرف انٹرنیٹ کی ویب سائٹوں سے حصولِ علم کا نشہ چڑھا ہوا ہے، اِن حالات میں اساتذہ کی اہمیت کو بیان کرنا لابدی اور نہایت ضروری ہوجاتا ہے۔

بانیٔ مرحوم کے اساتذہ میں سے تین حضرات (۱) حضرت مولانا عبدالحق

ہزارویؒ (۲) حضرت مولانا احمد میاں لاجپوریؒ اور (۳) حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھیؒ کے متعلق تو قطعی روایات موجود ہیں کہ آپؒ نے ان بزرگوں سے علم حاصل کیا ہے، ان کے علاوہ جن اساتذہ سے استفادہ کیا ہے بالتعیین معلوم نہ ہوسکا کہ کون کونسی کتابیں ان سے پڑھی ہیں؟ بانیٔ مرحوم کے دورِ طلبِ علمی کے سنین اور ان اساتذہ کے دورِ تدریس کے سنین کے توافق کو دیکھتے ہوئے افادہ اور استفادہ کے رشتے کو متعین کیا گیا ہے۔ تینوں اساتذہ کا تذکرہ ''ذکرِ صالحین'' میں موجود ہیں۔ دیکھیے جلد ثانی (۴۰ اور ۳۹۸)

حضرت مولانا امیر الدین سملکیؒ

بانیٔ مرحوم نے آپؒ سے مکتبی تعلیم (یعنی ناظرہ قرآن مجید اور اردو) حاصل کی ہے۔

آپؒ پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے، آپ کے والد حضرت حافظ معین الدینؒ چوں کہ سورت میں مقیم تھے؛ اس لیے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، اور ۱۴/ برس کی عمر میں علومِ ظاہریہ سے فارغ ہو گئے تھے، پھر حضرت خواجہ حبیب علی شاہؒ سے سلوک ومعرفت کی منزلیں طے کیں اور پھر سملک میں مقیم ہو گئے، یہاں آپ کے تقویٰ و پرہیز گاری کے پیشِ نظر آپؒ کو سملک کی مسجد کا امام بنایا گیا، آپؒ اسی مسجد میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے، بانیٔ مرحوم نے اسی زمانے میں آپ سے فیض حاصل کیا ہے۔

روز وشب عبادتِ الٰہی اور تلاوتِ کلامِ ربّانی آپؒ کا مشغلہ تھا، آپ جہاں جاتے قیامِ مدرسہ یا قیامِ مکتب کی ترغیب دیتے تھے، آپ نے نوساری میں ''مدرسہ معینیہ نظامیہ'' کے ساتھ ساتھ ایک لائبریری بھی قائم فرمائی تھی۔ شاید زندگی کے آخری ایّام میں نوساری منتقل ہو گئے تھے، اور قریش محلے کی مسجد میں اقامت اختیار فرمائی، وہیں ۱۹؍رجب ۱۳۲۹ھ مطابق ۳؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو انتقال ہوا، آپ کا مزار اسی محلّے کی مسجد میں واقع ہے۔

(مستفاد از: اکابرین گجرات ۴/۳۲۹۔ نقوشِ بزرگاں ۱/۷۹)

حضرت مولانا عبدالحق ہزارویؒ

بانیٔ مرحوم نے مکتبی تعلیم کے بعد فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم آپ سے حاصل کی۔

آپؒ متحدہ ہندوستان کے ضلع سرحد کے رہنے والے تھے جو آج کل پاکستان کا ایک صوبہ ہے، وہاں سے ہجرت کر کے ۱۷؍ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء میں گجرات تشریف لائے۔ ترکیسر کے ایک بزرگ، جنیدِ وقت: حضرت موسیٰ جی پیرؒ نے آپ کو ''کٹھور'' میں فروکش ہونے کا مشورہ دیا؛ اس لیے آپؒ پرب کی مسجد: کٹھور میں مقیم ہو گئے، چوں کہ ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ تھے، اس لیے باشندگانِ قریہ نے آپ سے استفادہ شروع کیا، اور ۳؍ماہ کی قلیل مدت میں لوگوں کا رجوع آپ کی طرف ہونے لگا۔

چوں کہ دینی بیداری کے لیے مدارس کا قیام بہت مفید ومؤثر ہے؛ اس لیے آپ نے اپنے معتقدین وماتحت حضرات کے سامنے ایک مدرسے کے قیام کی تحریک فرمائی، اوران لوگوں کے تعاون سے یکم ربیع الاول ۱۳۰۷ھ مطابق ۲۵/ اکتوبر ۱۸۸۹ء بروز جمعہ ''مدرسہ انجمنِ اسلام'' کا وجود ہوا۔

(تذکرۂ فخر گجرات: ۳۸، ۳۹۔ نقوش بسم اللہ ۱/ ۱۱۴)

حضرت مولانا صوفی احمد میاں لاجپوریؒ

بانیٔ مرحوم نے آپ سے عربی کی متوسط تعلیم حاصل کی ہے۔

آپ کا نام مولوی احمد میاں تھا، آپ کی ولادت قصبۂ لاجپور میں مؤرخہ ۹/ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ بروز چہارشنبہ ہوئی۔ آپ نے گجراتی اور اردو کی تعلیم ''اردو اسکول: لاجپور'' میں حاصل کی اور ابتدائی فارسی کی کتابیں اپنے والدِ بزرگوار حضرت شاہ صوفی سلیمانؒ سے پڑھیں، اور قرآن مجید حافظ احمد اوٹے والا مالویہ صاحبؒ سے پڑھا۔ بعد ازاں حضرت صوفی سلیمان صاحبؒ نے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی بھیج دیا، چار سال تک دہلی میں رہ کر مختلف علوم وفنون کی کتابیں متعدد اساتذہ سے پڑھیں، آپ کو ''مدرسۂ فتح پوری'' کے اساتذہ سے بھی تحصیلِ علم کا موقع ملا۔ تفسیر وحدیث مولانا رحیم بخش دہلویؒ (محشی تفسیراتِ احمدیہ ومؤلف حیاتِ دہلی) سے پڑھی، معقولات میں منطق، فلسفہ، ریاضی، اقلیدس، ہیئت، علمِ کلام وغیرہ کی درسی کتابیں مولانا محمد اسحاق صاحب دہلویؒ (تلمیذ حضرت

مولانا فضلِ حق خیرآبادیؒ) سے پڑھیں، بیس سال کی عمر میں تکمیل کر کے عالم وفاضل ہوکر دہلی سے ۱۳۱۳ھ میں لاجپور آئے، اس کے بعد لاجپور میں تعلیم کا سلسلہ جاری کیا اور للہ فی اللہ درس دینا شروع فرمایا، جس میں اطراف بلکہ دور دراز کے بہت سے طلبا نے آپ سے ایک معتد بہٖ علومِ عربیہ حاصل کیے، چناں چہ ضلع سورت کے اُس وقت کے اکثر علما آپ ہی کے تعلیم یافتہ تھے، اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ درسِ نظامی، مروجہ مدارسِ اسلامیہ: ہند کے طرز پر باقاعدہ ترتیب وار علومِ دینیہ کی تعلیم میں آپ کا درس ۱۳۲۰ھ کے قبل تک خصوصیت سے ممتاز تھا۔ اسی امتیازی تعلیم کا بہتر اور عمدہ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے شاگردوں میں تقریباً پندرہ صاحبان نے مختلف مدارسِ اسلامیہ میں پہنچ کر درسِ نظامی کی تکمیل کی اور علومِ عربیہ شرعیہ میں مہارتِ تامہ حاصل کی۔ اُس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ بہت صحیح ہے کہ: علومِ دینیہ، ضلع سورت میں آپ ہی کی ذاتِ بابرکات کا فیض تھا۔ چناں چہ مولانا احمد بزرگ صاحبؒ سابق مہتمم جامعہ ڈابھیل، کفلیتہ کے مولانا ابراہیم محمود پٹیل صاحبؒ، مولانا احمد درویش صاحبؒ، حاجی ابراہیم میاں صاحب سملکیؒ، مولانا عبدالرحمن صاحب بھوپالیؒ، مولوی الٰہی بخش پنجابیؒ، مولوی عبداللہ صاحب پنجابیؒ، مولوی وزیر خان صاحب حیدرآبادیؒ، مولوی یحییٰ صاحب بنگالیؒ، قصبۂ لاجپور کے مفتی مولانا مرغوب احمد صاحبؒ، مولوی سید عبدالحی صاحبؒ، مولوی محمد یوسف دیوان صاحبؒ، مولوی سید عمر صاحبؒ اور مولوی سلیمان حسن

جاڈاؒ؛ تمام حضرات آپ ہی کے سلسلۂ تعلیم سے فیض پائے ہوئے تھے۔

آپ کی تصنیفات مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) هدية الجليس شرح عقيدة النفيس (۲) امام غزالیؒ کی کتاب فاتحة العلوم کا ترجمہ (۳) کتاب تعليم المتعلم کا ترجمہ بہ نام دليل الطالب إلى مناهج المطالب (۴) توجيه الضأن إلى أن أبوي رسول الله ﷺ في الجنان (۵) ذخیرۃ العلوم میں بھی ایک کتاب تصنیف فرمائی۔

آپ کی مزید تصنیفی خدمات کا ذکر ''رشد وہدایت کے مینار'' میں بہ ایں الفاظ ملتا ہے: نخبۃ الفکر، مسلم الثبوت، شافیہ، الفیہ، تلخیص المفتاح، فصوص الحکم، عیون المسائل، بدء الامالی وغیرہ کتب کی شروحات تحریر فرمائیں، اور لوائحِ جامی، مناظرۂ رشیدیہ، خلاصۃ الحساب، شرحِ تہذیب، عروض المفتاح، ہدایۃ الہدایہ وغیرہ دسیوں کتابوں کا ترجمہ فرمایا؛ مگر افسوس! کہ ان میں سے چند ہی کتابیں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکیں اور بقیہ تشنۂ تکمیل ہی رہ گئیں۔

آپ نے عین عالمِ شباب میں بہ عمر ۳۳/ سال مؤرخہ ۷/ شعبان ۱۳۲۷ھ بروز سہ شنبہ مطابق ۲۴/ اگست ۱۹۰۹ء شب میں وفات پائی اور لاجپور کی جامع مسجد سے متصل پرانے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ آپ ہی کے دستِ بابرکت سے بانیٔ مرحوم نے اپنے مدرسہ تعلیم الدین کا افتتاح فرمایا تھا۔

(باغِ عارف: ۱۷، ۱۸۔ ذکر صالحین ۲/ ۱۷۴۔ رشد وہدایت کے مینار: ۱۳۳)

حضرت مولانا اسحاق بردوانیؒ

بانیٔ مرحوم نے آپ سے کانپور میں تعلیم حاصل کی ہے۔ آپؒ سے کن کن علوم کی تعلیم حاصل کی؟ معلوم نہ ہوسکا؛ نیز کانپور کے دیگر اساتذہ کا تذکرہ کرنے سے بھی ہم عاجز ہیں۔ (بیس بڑے مسلمان ص: ۴۲۲)

حضرت مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھیؒ

بانیٔ مرحوم نے مدرسہ عبدالرّب میں آپ سے احادیث کے اسباق پڑھے ہیں۔ آپؒ کی ولادت تقریباً ۱۲۷۰ھ میں ضلع میرٹھ کے قصبہ ''عبداللہ پور'' میں ہوئی، والد ماجد کا نام نصیب علی تھا، آپ قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے اجلۂ تلامذہ میں سے تھے، مولانا احمد حسن امروہویؒ آپ کے رفیقِ درس تھے، دارالعلوم سے ۱۲۹۴ھ میں فراغت حاصل کی اور مدرّسِ عربی کی حیثیت سے دارالعلوم ہی میں آپ کا تقرر ہوا۔ حضرت شیخ الہندؒ جب حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو واپسی تک مسندِ صدارت پر آپ ہی براجمان رہے، اُس زمانے میں صحاحِ ستہ کی مشکل اور اہم کتاب ترمذی شریف کا درس بھی دیا۔ ۱۲۹۸ھ میں مظاہرِ علوم تشریف لے گئے، پھر ۱۳۰۶ھ میں مدرسہ شاہی مرادآباد منتقل ہوئے، ۱۳۱۱ھ میں مستعفی ہوکر مدرسہ حسین بخش میں درس دینے لگے، پھر اربابِ مظاہرِ علوم کے اصرار پر ۱۳۱۲ھ میں واپس سہارنپور تشریف لے آئے۔ ۱۳۱۴ھ میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کے ایما پر دوبارہ دارالعلوم میں ''مدرّسِ دوم''

ہوکر مسندِ تدریس پر براجمان ہوئے، اور ۱۳۱۷ھ تک یہیں سے آپ کا فیض جاری رہا۔ رمضان ۱۳۱۷ھ کی تعطیل میں گھر تشریف لے گئے اور وہیں سے استعفا بھیج دیا، پھر ۱۳۲۱ھ تک مدرسہ حسین بخش میں درس کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس کے بعد ۱۳۳۱ھ میں اپنے خسر مولوی عبدالرّبؒ کے قائم کردہ مدرسہ عبدالربّ میں صدارتِ تدریس کو زینت بخشی اور تادمِ حیات یہیں درسِ حدیث میں مشغول رہے اور تشنگانِ علوم کو فیض پہنچاتے رہے۔

آپ کے دور میں مدرسہ عبدالربّ بہت مشہور ہوا، مولانا کو اس مدرسے سے اس قدر والہانہ شغف تھا کہ جب بڑھاپے میں کمزوریوں اور بیماریوں کی وجہ سے تعلیمی خدمات سے سبک دوش ہو گئے تھے تو اس حالت میں بھی آپ نے یہیں قیام فرمایا اور لبِ سڑک مدرسے کے ایک حجرے میں محوِ استراحت رہتے تھے۔

آپ کے حلقۂ تلامذہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، علاّمہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ، حضرت مولانا امین الدین اورنگ آبادی ثم دہلویؒ (مؤسس مدرسہ امینیہ دہلی) اور ہمارے بانیٔ مرحوم جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں ہیں۔ حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کو بھی آپؒ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔

طلبہ پر شفقت آپ کا نمایاں وصف تھا، اسی پر ایک جزئی واقعہ حضرت

مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ بیان فرماتے ہیں کہ: حضرت قاسم العلومؒ کے عاشق زار تلمیذِ رشید حضرت مولانا عبدالعلی صاحبؒ صدر مدرس وشیخ الحدیث مدرسہ مولوی عبدالرّب صاحب مرحوم کی شفقت ونظر نے مجھے گھائل کر دیا؛ اس لیے بجائے امروہہ کے دہلی ہی میں مقیم ہوگیا۔

آپ کے عشقِ نبوی کا یہ عالم تھا کہ آپ کے ایک تلمیذ، صاحبِ مقاماتِ خیر: مولانا ابوالحسن زید دہلویؒ فرماتے ہیں: یہ عاجز قصیدۂ بردہ کا مبارک شعر پڑھتا تھا اور آپ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہوجاتا تھا، آپ اتنا روتے کہ تکلّم نہیں فرما سکتے تھے، آپ کی لحیۂ مبارکہ سے آنسو کے قطرے ٹپکتے تھے۔

زہد وقناعت، تقویٰ وطہارت میں اپنی مثال آپ تھے، آخری سانس تک جماعت کی نماز اور صفِ اولیٰ ترک نہیں ہوئی۔ آخرِ عمر میں فالج کی وجہ سے نقل وحرکت سے معذور ہوگئے تھے، اس حالت میں بھی خدام وتلامذہ آپ کو اٹھا کر صفِ اولیٰ میں رکھ دیتے تھے اور آپ بیٹھ کر امام کی اقتدا فرماتے۔

اس بیماری کے عالم میں ایک مدّت تک درس دیتے رہے، چارپائی پر گاؤ تکیہ سے سہارا لگا کر تشریف فرماتے۔ بالآخر وقتِ موعود آپہنچا، پوری عمر خدمتِ حدیث میں گزار کر یک شنبہ ۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ مطابق ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو دہلی کے مدرسہ عبدالرّب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ جنازے میں گویا پوری دہلی امنڈ آئی تھی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ''مقبرۂ مہدیان'' میں آسودۂ خواب ہیں۔ (مستفاد از ذکر صالحین ۲/ ۲۷ تا ۶۲۔ الواح الصنادید ۱/ ۲۳۹)

حضرت مولانا امین الدینؒ

بانیٔ مرحوم نے مدرسہ امینیہ میں آپ سے استفادہ فرمایا ہے۔

آپ اپنے اس مدرسے کے بانی ومہتمم تھے۔تقریباً ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، پھر ایولہ ضلع ناسک میں سکونت اختیار کی۔ ۱۳۰۴ھ میں بہ غرضِ تحصیلِ علم دارالعلوم دیوبند گئے، درمیان میں کچھ عرصہ مدرسہ اعزازیہ شاہجہاں پور میں معقولات وغیرہ کا علم حاصل کیا، پھر واپس دارالعلوم دیوبند تشریف لاکر ۱۳۱۳ھ میں فارغ التحصیل ہوئے اور دہلی کو اپنی دینی وعلمی خدمات کا مرکز بنایا۔حضرت مفتیٔ اعظم ہند مفتی کفایت اللہ صاحبؒ آپ کے ہم درس تھے، زندگی بھر ان کا ساتھ نہ چھوڑا، آپ کی شادی ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء سید عابد علی دہلوی کی صاحب زادی سے ہوئی، آپ نے اپنی سسرال: گلی احمد شاہ کے قریب ایک مکان خرید کر ازسرِ نو بنوایا اور اس میں منتقل ہوئے۔

مولانا امین الدینؒ نے ماہِ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ میں مدرسہ امینیہ کی بنیاد رکھی، اس کی تاسیس کا ایمان پرور اور روح افزا نظارہ ملاحظہ کیجیے، ''مختصر تاریخِ مدرسہ امینیہ'' میں مرقوم ہے:

اس عظیم المرتبت اور جلیل القدر درس گاہ کی بنیاد کس طرح رکھی گئی، شاید آپ کو خیال ہوگا کہ پہلے ملک کے مشہور لیڈروں اور شہر کے ممتاز دولت مندوں کی کانفرنس بلائی گئی ہوگی، اور کئی دن کی بحث وتمحیص کے بعد وسیع پیمانے پر ایک

دارالعلوم قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہوگا اور بہت بڑی رقم منظور کی گئی ہوگی.....
.....نہیں! ایسا کچھ نہیں ہوا، (جو کچھ ہوا اسے خود بانیٔ مدرسہ مولانا امین الدینؒ کی زبانی سنیے:)

مفتی کفایت اللہؒ سے فرمایا: ارے بھائی مولوی کفایت اللہ! میں ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں، تم اس معاملے میں میرا ہاتھ بٹاؤ، حضرت مفتیٔ اعظمؒ نے فرمایا کہ: تمھارا خیال مبارک ومسعود ہے، میں دل سے تمھارے ساتھ ہوں؛ مگر سرِ دست میرا شاہجہاں پور جانا ضروری ہے؛ کیوں کہ میرے شفیق استاذ مولانا عبدالحق خانؒ جنھوں نے کوشش کر کے مجھے حصولِ تعلیم کے لیے بھیجا تھا، مجھے بلا رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ: ''مدرسہ ''عین العلم'' شاہجہاں پور کو تمھاری ضرورت ہے، جلدی آؤ''، استاذ کا حکم ماننا ضروری ہے، میں وہاں جا کر حالات کا جائزہ لوں گا، اگر موقع ہوا تو آجاؤں گا، فی الحال میری رائے یہ ہے کہ تم مولوی محمد انور (علامہ کشمیریؒ) کو بلالو، وہ بھی ان شاء اللہ تمھارے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔
.....مولانا نے شاہ صاحبؒ سے دریافت فرمایا کہ: تمھارے پاس کتنے روپیے ہیں؟ شاہ صاحب کے پاس اس وقت کل سات روپیے تھے، جو انھوں نے مولانا کو دے دیے اور انھیں سات روپیوں میں دہلی کے ٹکٹ خریدے گئے۔ اللہ اللہ! عزائم کتنے بلند اور عالی! ایک کے پاس صرف سات روپیے اور ایک کی جیب خالی! دہلی آئے اور سنہری مسجد چاندنی چوک میں شاہ صاحب کو بٹھا دیا، دو تین

طالب علم مہیا کر لیے، تعلیم وتعلّم کا سلسلہ شروع ہو گیا، کچھ دنوں کے بعد مولانا موصوف نے مولانا حافظ ضیاء الحق کو بھی دیوبند سے بلا لیا۔ لیجیے! افتتاح ہو گیا۔

شہر دہلی میں مولانا کا زہد وتقویٰ دور دور تک مشہور تھا، عملیات میں کافی مہارت رکھتے تھے، دل میں فیض رسانی کا جذبہ بھی رکھتے تھے، نرم خو، ملنسار، بااخلاق تھے؛ مگر دین کے معاملات اور مدرسے کے انتظامات کے سلسلے میں کسی کی رورعایت نہیں کرتے تھے۔ اپنے اقارب کی امداد واعانت فرماتے تھے، جب کبھی سفر سے واپس آتے تھے تو تمام قرابت داروں کے لیے تحفے ضرور لاتے تھے۔ سیاسی ہنگاموں اور دنیاوی مشغلوں سے دامن کش رہتے تھے، اپنے مکان میں ایک علاحدہ کوٹھڑی میں ذکر وعبادت میں مشغول رہتے تھے۔ طلبہ کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت ومحبت فرماتے تھے۔ آپ پرانی وضع کے بالکل سیدھے سادے مولوی تھے، دفتری امور میں مہارت نہیں رکھتے تھے؛ اس لیے مولوی عبدالغفور صاحب دہلوی مدرسِ فارسی بہ طور نائب مہتمم تمام دفتری امور انجام دیا کرتے تھے، حضرت مفتیٔ اعظمؒ کی تشریف آوری کے بعد مدرسے کا پورا نظام ان کے ہاتھ میں منتقل کر دیا تھا۔

اللہ اللہ! کیسے مخلص ہوتے تھے یہ لوگ! جذبہ تھا تو دین کی خدمت کا، علم کی اشاعت کا، کلمہ کی تبلیغ کا، نہ اپنی انا کا مسئلہ تھا، نہ مال وجائداد کی فکر تھی، شہرت وریاکاری تھی نہ نمائش وواہ واہی، ان کے اخلاص کی برکت سے کام بنتے چلے

جاتے تھے اور فسادات مٹتے چلے جاتے تھے۔

۱۹/رمضان ۱۳۲۸ھ ۶/جون ۱۹۲۰ء کو علم وعمل اور اخلاص وتواضع کا یہ پیکر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔ رحمہ اللّٰہ رحمۃ واسعۃ.

(ملخص از مختصر تاریخِ مدرسہ امینیہ: ۱۰ تا ۲۳)

دل میں خیال آتا ہے کہ ہمارے بانیٔ مرحوم (مولانا بھامؒ) اپنے ان ہی استاذ (مولانا امین الدینؒ) کا مکمل ونمایاں عکس تھے، مولاناؒ بھی خاموشی سے خدمتِ دین کا فریضہ انجام دے کر اپنے رب سے جا ملے اور بانیٔ مرحوم بھی ان کی روِش پر چلے۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ

مدرسہ امینیہ میں بانیٔ مرحوم (مولانا بھامؒ) نے آپ سے استفادہ فرمایا تھا۔ آپ کا وطنِ مالوف شاہجہاں پور تھا، آپ یمنی النسل تھے۔ سنِ پیدائش ۱۲۹۲ھ ہے، مکتبی تعلیم سے فارغ ہوکر ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزازیہ شاہجہاں پور میں مولوی حافظ بدھن خان اور مولوی عبدالحق خان سے حاصل کی، پھر مدرسہ شاہی مرادآباد تشریف لے گئے اور پھر دیوبند جاکر ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ نے دورۂ حدیث مولانا عبدالعلی میرٹھی اور حضرت شیخ الہندؒ وغیرہ سے پڑھا، پھر اپنے استاذ کے قائم کردہ مدرسہ ''عین العلم'' میں پانچ سال خدمت انجام دی اور قادیانیت کے تعاقب کے لیے ایک رسالہ ''البرہان'' کے نام سے جاری

کیا۔ ۱۳۲۱ھ میں اپنے استاذ مولانا عبدالحقؒ کی وفات کے بعد مدرسہ امینیہ چلے آئے اور زندگی کی آخری سانس تک اسی کو مرکز بنا کر ملت اسلامیہ کی خدمت کی، آپ اپنے اساتذہ کے بے حد معتمد تھے، حضرت شیخ الہندؒ تک فتویٰ نویسی میں آپ پر اعتماد کرتے تھے، آپ کا زہد وقناعت دیکھیے کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے پانچ سو روپیے ماہوار کی پیش کش ہوئی؛ مگر ضمیر کی آزادی نہ ہونے کے سبب دوسو پچاس کی اسی مدرسہ امینیہ کی ملازمت پر جمے رہے۔

آپ بہ یک وقت ہمہ جہت خدمات انجام دیتے تھے، چناں چہ کئی اداروں کے رکنِ رکین تھے، جمعیت علمائے ہند آپ کی کوششوں سے وجود میں آئی (تفصیل کے لیے دیکھیے: مختصر تاریخِ مدرسہ امینیہ: ۴۳) مدرسہ امینیہ اور مدرسہ فتح پوری کی انتظامی ذمہ داری، مسلم یونیورسٹی کی مجلسِ منتظمہ کی رکنیت، خلافت کمیٹی کی رکنیت وصدارت، آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی رکنیت، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی رکنیت جیسے اہم اور ذمہ دارانہ مناصب آپ کو حاصل تھے، قومی ہمدردی وملی خدمات، اتحادِ مدارس کی تحریک، قومی قیادت جیسے کاموں میں آپ ؒ نے اپنی حیاتِ مستعار کو خرچ فرمایا ہے۔

آپ کی خدمات کا دائرہ سرزمینِ عرب کو بھی محیط ہے، چنانچہ جب حجازِ مقدس کی زمین شریفِ مکہ کے ہاتھوں سے نکل کر سلطان ابنِ سعود کے قبضے میں آئی، اور انھوں نے اپنے نظریات کی بنیاد پر مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی پر اقدام

کیا، تو تمام ممالکِ اسلامیہ کے وفود مکۂ معظّمہ میں جمع ہوئے، جمعیتِ علمائے ہند کی ترجمانی کے لیے حضرت مفتیٔ اعظمؒ تشریف لے گئے اور پوری جرأت کے ساتھ سلطان کو متنبہ کیا اور اسے لاجواب کر کے چھوڑا۔

۱۹۲۸ء میں انگریزوں نے اپنے ناپاک منصوبہ کے تحت فلسطین کے دو ٹکڑے کر کے ایک حصہ ''یہود بے بہبود'' کو دے دیا تھا، اس پر پورا عالمِ اسلام تلملا اٹھا، مصر میں اس کے لیے ''مؤتمرِ فلسطین'' کا انعقاد ہوا، آپ وہاں تشریف لے گئے اور بہ بانگ دہل اعلان فرمایا کہ: اگر خدانہ خواستہ فلسطین کے عرب باشندے تقسیمِ فلسطین پر راضی ہو بھی جائیں، تب بھی ہم ہندوستانی کبھی اس پر راضی نہ ہوں گے اور اپنی جدوجہد برابر جاری رکھیں گے۔

آپؒ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں دو مرتبہ جیل بھی جا چکے ہیں: ایک مرتبہ ۱۹۳۰ء میں ۶/ ماہ قیدِ بامشقت کی سزا ڈسٹرکٹ جیل گجرات میں کاٹی، اور دوسری مرتبہ ۱۹۳۱ء میں نیوسنٹرل جیل ملتان میں ۱۸/ ماہ قیدِ بامشقت کی سزا برداشت کی۔

آپ کا مسلک تھا کہ'': مذہب کی آزادی، وطن کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے'' اور اس کے لیے جدوجہد کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے؛ مگر آزادی کے بعد دشمنانِ اسلام کی ساز باز کے نتیجے میں تمام امیدوں پر پانی پھر گیا، جس کی وجہ سے آپ دل برداشتہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے؛ مگر زندگی کے آخری ایام میں ایک

دل دوز واقعہ پیش آیا، یعنی ایک ہندی اخبار ''امرت پتریکا'' نے شرافت کا لبادہ اتار کر ننگا ناچ کیا، اور سرکارِ دو عالم، تاجدارِ بطحا، نبیٔ امی، نبیٔ رحمت، حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اقدس میں نازیبا کلمات کہہ کر جرأتِ بے جا کا اظہار کیا، چناں چہ ۱۴/اگست ۱۹۵۲ء کو شاہ جہانی جامع مسجد دہلی کے سامنے ایک عظیم الشان جلسہ آپ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر ضعف ونقاہت کے باوجود عشقِ رسول کی سلگتی چنگاری آپ کو یہاں کھینچ لائی، یہ آپ کی آخری صدارت تھی۔ ۱۳، ۱۴/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱/دسمبر ۱۹۵۲ء اور یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب، پنج شنبہ کو ڈیڑھ بجے اپنے رب کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

آپ کا مزار ''مہرولی'' میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے احاطے کے باہر ظفر محل کے متصل واقع ہے۔ آپ کے تلامذہ کی فہرست میں اکثر گجراتی علما کے نام نظر آتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے، مختصر تاریخِ مدرسہ امینیہ: ۳۰ تا ۶۷)

حضرت مولانا ضیاء الحق دیوبندیؒ

بانیٔ مرحوم نے مدرسہ امینیہ میں آپ سے حدیث شریف پڑھی ہے۔ آپ مولانا سراج الحقؒ کے فرزند تھے اور دیوبند کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ ۱۳۱۴ھ میں مفتیٔ اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ دہلویؒ اور علامہ کشمیریؒ کی

جماعت میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ حضرت مولانا امین الدینؒ نے جب مدرسہ امینیہ کا افتتاح فرمایا تو آپ کو دیوبند سے بلا کر ''مدرسِ دوم''① مقرر کیا، تب سے وفات تک مسلسل ۵۸ رسال آپ نے اسی ایک جگہ خدمت انجام دی، اور حضرت مفتیٔ اعظمؒ کی وفات کے بعد ''صدر مدرس'' مقرر ہوئے۔

آپؒ اپنے والد مولانا سراج الحقؒ کے مجاز تھے جو حضرت گنگوہیؒ کے خلفا میں شمار کیے جاتے ہیں؛ مگر کبھی آپؒ نے کسی کو بیعت نہیں کیا اور ہمیشہ اس اجازت کو پوشیدہ رکھا۔

ابتدا میں آپ کی تنخواہ مقرر نہیں تھی، صرف خوراک کے لیے چار پانچ آنے روزانہ لے لیا کرتے تھے، آپ نے ۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب میں مدرسہ امینیہ میں محصور رہ کر اس کی عمارت اور طلبہ کی جان بچائی تھی۔

مؤرخہ ۲۸ رجب ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹۵۴ء کو صبح دس بجے آپ حدیث شریف کا درس دے رہے تھے، یکا یک طبیعت میں کچھ امتلائی کیفیت پیدا ہوئی؛ مگر آپ برداشت کرتے رہے، سبق ختم کر کے ساڑھے دس بجے کے قریب آپ اپنے کمرے میں تشریف لے گئے، تین دن بسترِ مرگ پر رہ کر یکم شعبان ۱۳۷۳ھ بہ وقت ساڑھے نو بجے نماز عشاء سے فارغ ہو کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

---

① ''بیس بڑے مسلمان'' میں آپ کا عہدہ ''مدرسِ سوم'' لکھا ہے۔ واللہ اعلم

وفات کے وقت عمر شریف ۸۳ رسال تھی۔ آپ دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مزارِ مبارک کے قریب مدفون ہیں۔

(ملخص از تاریخ مدرسہ امینیہ: ۲۶ تا ۳۰۔ بیس بڑے مسلمان: ۴۲۲)

حضرت مولانا عبدالقادر ہزارویؒ اور حضرت مولانا قاسم دیوبندیؒ کے بارے میں معلومات دستیاب نہ ہوسکیں۔

بانیٔ مرحوم کے تلامذہ

بانیٔ مرحوم چوں کہ درس وتدریس سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، آپؒ کی تدریسی خدمت کا آغاز سورت شہر کے مدرسہ تراوا سے ہو چکا تھا، معلوم نہیں اس جگہ کس نے کن علوم کی تعلیم بانیٔ مرحوم سے حاصل کی؛ البتہ سملک کے زمانۂ تدریس میں ایک جمِّ غفیر نے آپؒ سے استفادہ کیا ہے، جن میں سے اکثر خود اپنے استاذ کی طرح گمنام رہ کر دنیا سے چلے گئے، آپ کے تلامذہ میں سے صرف چند کے نام تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ چوں کہ پھلوں کو دیکھ کر درخت کی کیفیت بہ خوبی معلوم ہوسکتی ہے؛ اس لیے آپ کے ممتاز طلبہ کا ذکر بھی بے سود نہ ہوگا۔

مفتیٔ گجرات حضرت مولانا مفتی اسماعیل بسم اللہؒ

آپؒ نے فارسی وعربی کی تعلیم بانیٔ مرحوم سے حاصل کی تھی۔ آپ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں ڈابھیل کے ''اونچا محلہ'' میں پیدا ہوئے، دس سال کی عمر میں حافظ سلیمان وانجھہ سے حفظِ قرآن کی تکمیل فرمائی۔ ساتھ ساتھ سات کلاس تک عصری تعلیم بھی حاصل کی۔ جب بانیٔ مرحوم نے مدرسہ کا افتتاح فرمایا تو اولین طلبہ میں آپ بھی داخل ہوئے، فارسی وعربی پڑھی، پھر آگے تعلیمی ترقی کے خاطر مدرسہ انجمنِ اسلام کٹھور تشریف لے گئے، ہوسکتا ہے کہ اس وقت مدرسہ تعلیم الدین میں فارسی وعربی تک تعلیم کا سلسلہ رہا ہو، اور بانیٔ مرحوم نے آپ کو اپنے نقشِ قدم پر

چلا کر اپنے استاذ محترم مولانا عبدالحق ہزارویؒ کی خدمت میں اگلے تعلیمی مرحلے کے لیے بھیج دیا ہو۔

بہر حال دوسال کٹھور میں تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند کا رُخ کیا، دیوبند جانے سے پہلے واپس مدرسہ تعلیم الدین میں داخلہ لیا۔لگتا ایسا ہے کہ آپ کے زمانے میں ہی مدرسہ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا تھا،اس زمانہ میں مولانا احمد بزرگؒ مدرسہ میں استاذ کی حیثیت سے مقرر ہو چکے تھے،ان سے بھی استفادہ فرمایا۔دارالعلوم کے زمانۂ طلبِ علمی میں شرحِ وقایہ پڑھ رہے تھے کہ آپؒ کا نکاح کر دیا گیا، کچھ عرصہ گھر پر گزار کر دیوبند کے بجائے دہلی مدرسہ امینیہ چلے گئے، یہاں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ سے خوب استفادہ کیا، ۱۳۳۶ھ تک ہدایہ، مشکوٰۃ وغیرہ کی تعلیم حاصل کر لی، اور ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند پہنچ کر فارغ التحصیل ہوئے، بخاری وترمذی حضرت علامہ کشمیریؒ سے دیوبند میں پڑھیں۔

آپ کی جماعت میں قاری طیب صاحب اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا محمد ایوب اعظمی جیسی مایۂ روزگار ہستیاں تھیں۔فراغت کے بعد سملک کی مسجد میں تراویح پڑھائی اور ڈابھیل ''اونچا محلہ'' میں امامت بھی کی۔ ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء کو بحیثیتِ معلم ومدرس افریقہ پہنچے، ساڑھے تین یا چار سال وہاں خدمت انجام دیتے رہے اور ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۴ء کو واپس وطن تشریف لائے، یہاں اپنی مادرِ علمی مدرسہ تعلیم الدین میں آپ کا تقرر ہوا، یہ زمانہ آپ کے

استاذ مولانا احمد بزرگؒ کے اہتمام کا تھا۔ ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء تک یہاں درس دیتے رہے، پھر ۱۹۳۵ء تک رنگون سورتی جامع مسجد کے مسندِ افتاء کو اپنی خدمات سے بہرہ ور کرتے رہے، رنگون کے قیام کے دوران مہتممِ جامعہ مولانا احمد بزرگؒ چندے کے لیے رنگون تشریف لے گئے تو اپنے استاذ کا خوب تعاون کیا۔ وہاں پر جاری غیر شرعی رسومات کے خلاف ببانگ دہل فتوے دیے، اسی قسم کے ایک فتوے کی بنا پر آپ کو رنگون چھوڑنا پڑا؛ مگر جوہر کی قدر جوہری کو ہوتی ہے دوسروں کو نہیں؛ اس لیے آپ کے استاذ حضرت مولانا احمد بزرگؒ نے آپ کو جامعہ میں مدرّس کی حیثیت سے مقرر کرلیا، جامعہ میں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے چلے جانے کے بعد مسندِ افتاء خالی تھی۔ آنے والے فتاویٰ کے جواب مہتممِ جامعہ حضرت مولانا احمد بزرگؒ دیا کرتے تھے، جب مفتی صاحب تشریف لائے یہ مسند اُن کو عطا کردی گئی۔ درمیان میں چند سال نائب مہتمم اور پھر مہتمم بھی رہے، اخیر میں صرف دارالافتاء کی خدمات پر اکتفا کیا اور تادمِ آخر اسی میں مشغول رہے۔

آپ کو اپنی مادرِ علمی سے کس قدر لگاؤ تھا اور اپنے استاذِ محترم کے لگائے ہوئے چمن کی آبیاری کی کیسی فکریں سوار تھیں، جس وقت آپؒ کے خلاف الزامات وبدگمانیوں کی یورش تھی، بدخواہ آپ کو ایک لمحہ چین کا سانس نہ لینے دیتے تھے، اور جامعہ میں آپ کا جینا دوبھر ہو چکا تھا، اسی زمانے میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب سملکیؒ نے مجلسِ خدّام الدین کے تحت دارالافتاء قائم فرما کر آپ کو مدعو کیا؛

مگر حضرت کا جواب ملاحظہ کیجیے: ''میرے پیر قبر میں لٹک چکے ہیں، ایسے نازک حالات میں جامعہ چھوڑ دوں تو اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا''۔

آپؒ ۱۳۷۱ھ میں اہتمام سے الگ ہوئے، فتنہ پروروں کی ریشہ دوانیاں پریشان کیے ہوئے تھیں، ہمارے زمانے کے مزاج کا تقاضا تو یہی ہوتا کہ آپ جامعہ سے الگ ہوجاتے، اور جامعہ جب مصیبتوں کے بھنور میں پھنس جاتا تو باہر ہی سے مخالفین پر ہنستے، مگر آپ حضرات نے ابھی پڑھا کہ جامعہ چھوڑنے پر آپ کو خیال آیا کہ خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا، اس لیے تادمِ آخر جامعہ سے جڑے رہے، اہتمام سے الگ تو ہوئے؛ مگر دارالافتاء میں آپ کی خدمات جاری رہیں اور سراجی وہدایہ آخرین بھی پڑھاتے رہے۔ یہ بھی ایک کٹھن مرحلہ تھا اس وقت کی دلی کیفیت کا اندازہ لگائیے، ایک اہم اور اونچے منصب پر تھے اس کو چھوڑ کر ایک ماتحت منصب پر چلے آئے؛ مگر دل میں ذرا سی بھی رنجش نہیں ہے۔ خود آپ کے الفاظ پڑھیے: اب میں فقط بطورِ مفتی ہی خدمت انجام دیتا ہوں، اہتمامِ مدرسہ کے نظم وانصرام سے میرا کوئی تعلق اور واسطہ نہیں، قوم اور تمام متعلقین اس کو نوٹ فرمالیں۔ (ہفت روزہ مسلم گجرات، بحوالہ نقوشِ بسم اللہ ۱/ ۲۱۹)

آپ کی شانِ فقاہت کی شہادت کے لیے نبّاضِ وقت حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ کا بیان کافی ہے، فرماتے ہیں:

''اس آدمی کے فتاویٰ سے تفقہ کی بو آرہی ہے''۔ (تاریخِ جامعہ: ۳۲۴)

خوبیوں وکمالات کا یہ گنج گراں مایہ، بانیٔ مرحوم کا تلمیذِ رشید ۱۶ /شوال المکرم ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۴ /اپریل ۱۹۵۹ء جمعہ وہفتہ کی درمیانی شب، رات گیارہ بجے محبین ومخلصین کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے رب کے حضور اپنی محنتوں کا انعام واکرام پانے کو پہنچ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت مولانا علی محمد تراجویؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، اور ڈابھیل میں تالاب کے کنارے آدم پیر کے قبرستان میں مولسری کے درخت کے نیچے حضرت گنگوہیؒ کے مریدِ باصفا حضرت مولانا سراج احمد رشیدیؒ کے پہلو میں آپؒ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ (مستفاد از نقوشِ بسم اللہ ۵۷ تا ۳۰۰)

حضرت مفتی اسماعیل صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ

آپؒ نے بانیٔ مرحوم سے ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ ڈابھیل کے ایک متمول دیندار، علما وصلحا کے قدردان، بانیٔ مرحوم کے دوست، جناب موسیٰ صاحبؒ کی دخترِ نیک اختر ہیں، آپؒ کی ولادت ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ ڈابھیل کے دو بزرگوں - شیخ جلال الدین عثمانی اور صوفی عابد میاں عثمانی - سے بھی شرفِ تلمذ حاصل تھا، بچپن ہی سے خدمت کا ذوق تھا، چناں چہ صبح سویرے شیخ جلال الدینؒ کو قہوہ بنا کر پیش کرتیں، بانیٔ مرحوم ان کے گھر جاتے اور چائے کی فرمائش کرتے تو آپؒ چائے بنا کر خدمت میں پیش کرتیں، صوفی عابد میاںؒ نے آپ کے متعلق پیشین گوئی کی تھی کہ ''اس بچی کی شادی اپنے زمانے کے بہت

بڑے عالم سے ہوگی''۔عرصۂ دراز کے بعد مفتیٔ گجرات حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہؒ سے نکاح ہوا، ہمارے بانیٔ مرحوم نے بھی ان کے سامنے ایک پیشین گوئی کا ذکر کیا تھا، جس کا ذکر آچکا ہے۔آپ مالدار گھرانے کی چشم و چراغ تھیں؛ مگر حضرت مفتی اسماعیلؒ کے غربت کدہ میں بڑی تنگی ترشی سے گذر بسر کی، ان کے والد نے نصیحت کی تھی کہ بیٹی صبر کرنا! اللہ تجھے سُکھی رکھے۔آپ کی وفات ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۸۹ء کو تقریباً نوّے سال کی عمر میں جمعہ کے دِن ہوئی۔

(مستفاد از نقوش بسم اللہ ۱۲۲ تا ۱۲۵)

فخرِ گجرات حضرت مولانا علی محمد تراجویؒ

آپ نے بانیٔ مرحوم سے ابتدائی فارسی پڑھی، آپ کی ولادت ۱۳۱۲ھ، مطابق ۱۸۹۳ء کو تراج میں ہوئی، عصری علوم کے بعد دینی علوم حاصل کرنا چاہا اور چودہ سال کی عمر میں مدرسہ تعلیم الدین میں داخلہ لیا۔ بانیٔ مرحوم کی خصوصی توجہات آپ کو حاصل تھیں، فرماتے تھے: ''علی! میں تجھے پہلے منشی، پھر قاری، اور پھر مولوی بناؤں گا''۔آپ نے یہیں خوش نویسی بھی سیکھی، پھر مدرسہ انجمنِ اسلام کٹھور تشریف لے گئے، آپ کے مدرسہ تعلیم الدین چھوڑ کر کٹھور جانے کا واقعہ گذر چکا ہے، وہاں حفظ مکمل کیا، اردو فارسی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، پھر قرأت کے لیے الٰہ آباد کا سفر کیا، اور ہندوستان کے مشہور ومعروف قاری ومقری حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی مکیؒ کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کیا، اس سفر کے خرچ کا انتظام بھی خود بانیٔ

مرحومؒ نے کیا تھا۔ یہ ۱۳۲۹ھ کا زمانہ تھا، قراءت سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند پہنچے۔ ۱۳۳۶ھ میں سندِ فراغت حاصل کی، پھر ایک سال افتاء وغیرہ کی مشق کرتے رہے، ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں ''معین المدرسین'' کے طور پر تقرر ہوا، ۱۳۳۹ھ تک دارالعلوم میں درس دیتے رہے، چوں کہ مولانا احمد بزرگؒ کے ڈابھیل آجانے کی وجہ سے رنگون کا دارالافتاء بے رونق ہوگیا تھا؛ لہٰذا اہلِ برما نے آپؒ کو دعوت دی اور آپؒ رنگون میں افتاء کی خدمت کے لیے چلے گئے۔

رنگون سے واپسی پر حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، واپس آکر اپنے وطن تراج میں ۱۳۴۲ھ، مطابق ۱۹۲۳ء میں ایک مدرسہ ''مفتاح العلوم'' کی بنیاد ڈالی، جس کی وجہ سے بہت سی بدعات ختم ہوئیں، مدرسہ کی بنیاد رکھنے میں اپنے استاذِ محترم ہی کی پیروی کی، جس طرح بانیٔ مرحوم نے اپنے مکان کے ایک حصہ میں تعلیم وتعلّم کا سلسلہ جاری فرمایا تھا، اسی طرح آپؒ نے بھی اپنے ہی مکان کے بیرونی حصہ میں ایک چبوترے پر چند بچوں کے ذریعہ مدرسہ کی ابتدا کی۔ استاذ شاگرد کے درمیان ایک اور غیر اختیاری نسبت مشاہدہ فرمائیے کہ بنائے جامعہ کے وقت جتنی عمر استاذ کی تھی اتنی ہی عمر میں آپ نے اپنے مدرسہ کی بنیاد رکھی ہے۔ مدرسہ میں بڑی کسمپرسی کے عالم میں انتظام واہتمام اور تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، معاشی مشکلات کا مقابلہ بڑی دیدہ دلیری سے کیا۔

آپ ادبی ذوق کے بھی حامل تھے، جس کا اندازہ آپ کے نظمیہ ونثریہ

کلام سے لگایا جاسکتا ہے، جو آپ کی سوانحِ حیات میں چھپا ہوا ہے، آپ جامعہ ڈابھیل کی رکنِ شوریٰ کے ممبر بھی رہے ہیں، اور اسی واسطے سے اپنی مادرِ علمی کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، آپؒ نے چوں کہ بانیٔ مرحوم ہی کی عنایت وکرم اور احسان سے اپنی علمی منازل طے کی تھیں، اس لیے بانیٔ مرحوم اور جامعہ سے آپ کو ایک مضبوط اور گہرا قلبی ربط تھا، چناں چہ بانیٔ مرحوم کی وفات پر ایک مرثیہ تحریر فرمایا۔ اس کے مضامین کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے بڑا طویل مرثیہ کہا ہوگا؛ مگر کیا کہیے زمانہ کی ستم ظریفی کو! ذرا سی غفلت ہوئی اور سارا سرمایہ ضائع ہوا! لے دے کے چند اشعار ہمیں مل سکے ہیں، جن کو سوانحِ حیات سے بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:

مرثیہ حضرت مولانا احمد حسن بھام مرحوم مغفور سملکی

نتیجۂ فکر: ناچیز علی محمد

آرہا ہے کیوں نظر ہر اک دریدہ پیرہن
کر رہے ہیں چاک کیوں اپنا گریباں اہلِ فن
بیٹھا بیٹھا درد، دل میں آج کیوں ہونے لگا
دھیمے دھیمے ہو رہی ہے کیوں کلیجے میں جلَن
طائرِ فکر کیوں پریشاں ہے سمجھ پڑتی نہیں

رُک گئے ہیں بلبلوں کے چہچہے کیوں در چمن
محوِ حیرت ہو رہا تھا ناگہاں آئی ندا
ہو گئے واصل الی اللہ مولوی احمد حسن
خون کے آنسو نہ کیوں روؤں میں اے ربِّ ہمیش!
چل بسا وہ، ملتِ بیضا کی تھی جس کو لگن
کر گیا وہ کوچ اس دنیا سے اے اہلِ جہاں!
جس کی خدمت سے منور ہو رہا تھا یہ وطن
یاد میں تیری وہ اصلاحِ وطن کی کوششیں
منعقد اس کے لیے ہوتی رہی تھی انجمن
لومۃ لائم کی ہرگز تو نے کچھ پرواہ نہ کی
اور سنے تو نے ہزاروں طعن ہائے پیروزن

(تذکرۂ فخر گجرات:۱۱۱)

افسوس صد افسوس! پیاس باقی تھی اور ساقی نے پیالہ چھین لیا، کاش! بے رحم زمانہ آپ کی بیاض میں پورا قصیدہ رہنے دیتا تو بانیٔ مرحوم کے مزید اوصاف ہماری نظر نواز ہوتے اور مستقبل کی علمی وعملی زندگی سنوارنے میں مددگار ثابت ہوتے۔

آپ چوں کہ حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہؒ کے ہم درس اور مخلص رفیق تھے؛ اس لیے مفتی صاحبؒ کے دورِ اہتمام میں اکثر اہم امور آپؒ کے مشورے

سے انجام پاتے، مفتی صاحبؒ حالات کی نزاکت کی بنا پر اہتمام سے سبک دوش ہونے کا ارادہ فرماتے تو آپ ہی ان کو سنبھالا دیتے اور اپنی مادرِ علمی کی حفاظت کا سامان فراہم کرتے، چناں چہ آپ کی سوانح میں لکھا ہے، خود فرماتے ہیں:

''جامعہ کی حالت نے کروٹ لی، انتظام واہتمام کی لگام مفتی صاحبؒ کے ہاتھ میں آ گئی، اس زمانے میں جب کوئی نئی صورت پیدا ہوتی اور مفتی صاحب کا دل اس سے متأثر ہوتا تو مجھے یاد فرماتے، اور تمام حالات کو بیان فرما کر میرا مشورہ لیتے، میں اپنی سمجھ کے مطابق مشورہ دیتا۔ انتظام کے زمانہ میں کئی مرتبہ ایسے نازک اور مشکل حالات پیش آئے کہ مفتی صاحب نے انتظام کی ذمہ داری سے سبک دوش ہونے کا ارادہ کرلیا؛ لیکن میں ان کو یہی مشورہ دیتا رہا کہ آپ اس خدمت کو نہ چھوڑیں۔ (الاصلاح مفتیٔ گجرات اور تاریخِ جامعہ)

آپ کی ان توجہات کی بنا پر اربابِ جامعہ کو جو جھٹکا آپ کی وفات کے موقع پر محسوس ہوا، اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے ۱۳۸۷ھ کی روئیداد میں درج ہے۔

''طویل عرصے سے جامعہ کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے، اور مفید مشوروں سے نوازتے رہے، گجرات کے محقق علما میں آپ کا شمار ہوتا تھا، مدرسہ مفتاح العلوم کے بانی اور ناظم ہونے کے ساتھ ساتھ دینی خدمات والی ہر مجلس کے ساتھ قلبی تعلق رہا جن کے رخصت ہونے سے جامعہ اپنے ایک مشفق سرپرست سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور امتِ محرومہ کو بہترین نعم البدل

نصیب فرمائے، آمین''۔

آپ نے متعدد پلیٹ فارم سے ملتِ اسلامیہ کی خدمت انجام دیں، تعمیرِ مساجد، رنگون میں دارالافتاء، فصلِ خصومات، دعوت وتبلیغ وغیرہ خدمات آپ کے اعمال نامے کی زینت بنیں۔ زندگی کے آخری ایام میں صاحبِ فراش ہو چکے تھے، مگر اتباعِ شریعت کا جذبہ اپنے شباب پر تھا، اپنی فوت شدہ نمازوں اور روزوں تک کا فدیہ ادا کرنے کی وصیت اور انتظام فرمادیا تھا۔

بالآخر زندگی کے اس تھکے ماندے مسافر کو ۶/ ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ، مطابق: ۶/ فروری ۱۹۶۸ء شب دو بجے قرار آ ہی گیا، اور آپ اپنے رب کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ جامعہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمیؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی موجودگی میں آپ کو تراج کے قدیم قبرستان میں آغوشِ لحد کے سپرد کردیا گیا۔

(مستفاد از تذکرۂ فخر گجرات: ۳۳ تا ۱۶۷)

بانیٔ مرحوم کے تلامذہ میں دو نام اور ملتے ہیں: (۱) حضرت مولانا باقر علیؒ سارسا، ضلع: کھیڑا اور (۲) حضرت مولانا شرف الدین صاحب ہاڈگڈ، ضلع: کھیڑا۔ یہ دونوں حضرات ابتدائی زمانے میں مدرسہ تعلیم الدین سملک میں زیرِ تعلیم تھے، اسی زمانے میں بانیٔ مرحوم سے استفادہ فرمایا؛ مگر ان کے تفصیلی حالات تک رسائی نہ ہوسکی، یہ دونوں حضرات بھی مولانا علی محمد تراجویؒ اور مفتی اسماعیل بسم اللہؒ کے ہم

درس تھے۔ (مستفاد از نقوشِ بسم اللہ: ۱ / ۱۱۳)

یہ تو وہ تلامذہ ہیں جن کا ذکر تاریخ میں محفوظ رہ گیا، ورنہ آپ نے کن جیالوں کو تیار کیا ہوگا اور کس قسم کی فعّال ومتحرک جماعت امت کو فراہم کی ہوگی اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

بانیٔ مرحوم کا خاندان①

انسان کے کمال کی بنیاد تو اس کے اندر ودیعت کردہ صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہے؛ تاہم نسلی شرافت کا بھی اس میں کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے، اسی لیے حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جس قبیلہ وخاندان کا فرد بنایا گیا وہ سب سے اعلیٰ واشرف تھا۔ بانیٔ مرحوم کے اوصاف آپ ملاحظہ کر چکے، ان کے والد صاحب کی شخصیت کا تعارف آرہا ہے، اس پس منظر میں جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ بانیٔ مرحوم کا خاندان شرافت ونجابت سے مالا مال تھا، اسی مناسبت سے آپؒ سے نسبی قرابت رکھنے والے خوش نصیب افراد کا ذکر بھی ان شاء اللہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

بانیٔ مرحوم کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: احمد بن حسن بن ابراہیم بن سلیمان بن ابراہیم بن موسیٰ بن قاسم۔

جہاں تک آپ کے خاندان کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں حضرت مولانا تجمل حسین فضلی مشہدیؒ جو بانیٔ مرحوم کے رفیقِ خاص تھے، اپنی فارسی نظم میں بانیٔ مرحوم کے بارے میں رقم طراز ہیں:

---

① بانیٔ مرحوم کے خاندان کی معلومات حضرت قاری عبداللہ میاں سملکی مدّظلّہ کی کرم فرمائی سے دستیاب ہوئی ہے آں جناب نے بانیٔ مرحوم کے خاندان کے افراد پر مشتمل ایک نقشہ عنایت فرمایا، اسی کے حوالے سے یہ معلومات آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہیں۔

بود از قومِ بوہرہ بھام آمد عرف وے	خیر خواہی کرد بہرِ قوم خود از جان وتن

جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ سنی بوہرہ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

بوہرہ قوم کی تاریخ

بوہرہ قوم کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ یہ قوم شیخ ملا حیدریؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی تھی، جن کی قبر گجرات کے ایک مشہور مقام: کھمبایت میں ہے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر (متوفی: ۱۳۴۱ھ) نے اپنے زمانے کے اعتبار سے اس قوم کے اسلام کو تقریباً سات سو برس پہلے بتایا ہے، اس لحاظ سے بوہرہ قوم کے مشرف بہ اسلام ہونے کا واقعہ چھٹی صدی ہجری میں پیش آیا ہوگا۔

یہ قوم گجرات میں متعدد شہروں اور دیہاتوں میں بود و باش رکھتی ہے، ان کا تعلق زیادہ تر زراعت وزمین سے ہے، بڑی محنتی اور جفاکش قوم ہے، سادگی وخلوص لیے ہوئے ہے، جو کسانوں کا خاصہ ہے۔ مولوی سید عبدالاحد قادریؒ برادر مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوریؒ رقم طراز ہیں: ایک بڑی خوبی اس قوم میں یہ رہی کہ علمیت میں کم ہونے کے باوجود عمل میں بہت آگے ہے، چناں چہ یہ عمل ہی کی برکت ہے کہ آج علم میں بھی وہ بہت سوں کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ (نقوشِ بزرگاں ۱/ ۷۰، ۷۱)

سنی بوہرہ میں مختلف قبائل وخاندان ہیں، اسی کی ایک شاخ ''بھام خاندان'' بھی ہے۔

بانیٔ مرحوم کے والد بزرگوار

حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد لاجپوریؒ آپ کے والدِ بزرگوار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا کے والد ''حسن پٹیل''، سملک کے باشندے، زراعت پیشہ اور بستی کے پٹیل (چودھری) تھے، اپنے اثر ووجاہت کی وجہ سے معزز ومعروف تھے، ذی حوصلہ وباہمت شخص تھے، نیکیٔ خیال اور بلندیٔ کردار کی وجہ سے اپنے خاندان اور احباب واقران سے ممتاز تھے۔ قوتِ انتظامیہ بڑی تھی، اس لیے بستی اور گردونواح کے جھگڑے اور فساد کے اکثر معاملات آپ کے ہاتھ سے طے ہوتے تھے، نہایت مہمان نواز تھے، اکثر علما، مشائخ ودرویشوں کا قیام آپ کے ہاں رہتا تھا، اس وجہ سے آپ لوگوں میں ہر دل عزیز تھے''۔

آپؒ نے دو نکاح کیے تھے، پہلی اہلیہ کا نام: عائشہ ابراہیم گارڈی ہے، ان سے تین اولاد ہوئیں، اور دوسری اہلیہ کا نام: حورہ احمد موٹا ہے، ان سے پانچ اولاد ہوئیں۔ ہمارے بانیٔ مرحوم ان ہی دوسری اہلیہ کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔

اخوان واخوات

بانیٔ مرحوم اپنے والد صاحبؒ کی کل اولاد میں ساتویں نمبر پر دنیا میں تشریف لائے، اور اپنی والدہ صاحبہ کی اولاد میں چوتھے نمبر پر۔ آپ کے کل چار

بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ ترتیب یوں ہے: (۱) خدیجہ (۲) سلیمان (بنگلہ ماما) (۳) فاطمہ (تینوں علاتی بھائی بہن ہیں) (۴) محمد (۵) صالح (۶) ابراہیم (۷) عائشہ۔ یہ چاروں آپؒ کے حقیقی بھائی بہن ہیں، آپؒ ابراہیم و عائشہ کے درمیان تھے۔

(۱) خدیجہ: تمام بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں، ان کا نکاح محمد ڈایا سے ہوا تھا، پانچ بیٹے اور ایک بیٹی یادگار رہیں۔

(۲) سلیمان (بنگلہ ماما): بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، چار بیویاں کی تھیں، فاطمہ احمد گارڈی، انیسہ (آسٹریلیا)، خدیجہ ابراہیم سورتی، ظہورن (ڈربن)۔ ان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

(۳) فاطمہ: بانیٔ مرحوم کی دوسری بہن ہیں، ان کا نکاح محمود اسماعیل میاں سے ہوا تھا، دو بیٹے اور ایک بیٹی یادگار رہیں۔

(۴) محمد: بانیٔ مرحوم کے حقیقی بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، ان کا نکاح عائشہ موسیٰ ڈایا نامی خاتون سے ہوا ہے، دو بیٹے یادگار چھوڑے تھے۔

(۵) صالح: ان کا نکاح سکینہ ابراہیم آدم سے ہوا اور ایک بیٹا خلیل احمد یادگار چھوڑا۔

(۶) ابراہیم: بانیٔ مرحوم سے بڑے تھے، بانیٔ مرحوم سے خصوصی محبت اور آپ کے مدرسے سے خاص تعلق رکھتے تھے، اور مدرسہ کی ترقی کی کوششوں میں

سب بھائیوں سے بڑھ کر تھے، طاعون میں شہید ہوئے، افریقہ میں مدفون ہیں، ان ہی کی وفات کے صدمہ میں بانیٔ مرحوم نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا، آپ کی دو بیویاں تھیں، فاطمہ موسیٰ آدم اور عائشہ موسیٰ ایکھلو ایا، بانیٔ مرحوم نے ان ہی کے خاندان میں اپنی اولاد کا نکاح کروایا تھا، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔

(۷) عائشہ: بانیٔ مرحوم کی حقیقی بہن ہیں، تمام بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں، ان کا نکاح سلیمان اسماعیل میاں سے ہوا تھا، تین بیٹے اور تین بیٹیاں یادگار چھوڑی ہیں۔

زوجۂ محترمہ

بانیٔ مرحوم کا نکاح ایکھلو ایا خاندان میں محترمہ خدیجہ اسماعیل ایکھلو ایا سے ہوا، یہ وہ باسعادت خاتون ہیں جن کے زیورات بانیٔ مرحوم کی دینی خدمات کے پیچھے کھپ گئے تھے۔

یہ بات سچ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی بنا پر تنِ تنہا کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا، وہ کسی سہارے کا محتاج ہوتا ہے، ظاہر ہے عالمِ اسباب میں انسان کے لیے رفیقۂ حیات سے بڑھ کر اَور کونسا سہارا ہوگا، ہم دیکھتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے پیچھے حضرت خدیجہؓ کا ایسا زبردست ہاتھ تھا جن کی احسان مندی کا اقرار آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم زندگی کے آخری لمحات تک کرتے رہے۔ حضرت عائشہؓ جیسی محبوبہ بھی حضرت خدیجہؓ کی یادوں کو مضمحل

نہ کرسکی۔ وحیٔ الٰہی کے گراں قدر بوجھ کا تحمل کرنے میں جو مدد اور سہارا بی بی خدیجہؓ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوا، بھلا وہ اور کہاں سے مل سکتا تھا؟

یقیناً یہ منظر ہمارے بانیٔ مرحوم کی ازدواجی زندگی میں جھلکتا ہوگا، آپؒ نے جو زنجیر تھامی تھی اس کا آخری سرا حیاتِ نبوی سے جا کر ملتا ہے۔ بانیٔ مرحوم کی جو قربانیاں تھیں اور اس میں آپ کو جو استقامت ملی تھی ان سب کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ: آپ کی اہلیہ محترمہ نے قدم قدم پر آپ کو دلاسا دیا ہوگا، جب ہمتیں ٹوٹتی ہوں گی تو یہ خاتون آپ کی ہمتوں کو مہمیز کرتی ہوگی۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور درماندگی کے بعد بانیٔ مرحوم آپ کے پاس جاتے ہوں گے تو یہ خاتون اپنی مسکراہٹوں سے آپ کے لیے تازگی وفرحت کا سامان مہیا کرتی ہوں گی، غرض آپ کی تمام مساعیٔ جمیلہ میں ان کا ایک معتد بہ حصہ رہا ہوگا۔ ۱۳۸۳ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے، بانیٔ مرحوم کی زندگی میں تو ان کا یہ حال تھا ہی؛ مگر جب شوہر نہ رہے تو ان کا لگایا ہوا پودا تو کہیں گیا ہی نہیں، زندگی بھر اس کی سینچائی کرتی رہیں۔

''تاریخِ جامعہ'' میں ۱۳۸۳ھ کے حادثات میں لکھا ہے کہ: تیسرا حادثہ محسنِ ملّت مولانا احمد حسن بھامؒ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہے، مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد بھی اخیر تک مرحومہ کو اپنے شوہر کے لگائے ہوئے اس دبستانِ علم سے گہرا تعلق تھا، بڑی نیک دیانت دار بیوی تھیں، اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے۔ (روئیداد ۱۳۸۳ھ بحوالہ تاریخِ جامعہ: ۱۸۲)

بانیٔ مرحوم کی اولاد

بانیٔ مرحوم کا اپنی اہلیہ محترمہ اور اولاد کے ساتھ کیا معاملہ تھا؟ اس کی تفصیلات تو دستیاب نہیں ہیں، تاہم آپ کی زندگی میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس اور پاکیزہ زندگی کی پرچھائیاں ہمیں جابہ جا ملتی ہیں؛ اس لیے اپنے اہل کے ساتھ آپ کی معاشرت میں بھی وہی رنگ ہو تو اس میں استبعاد ہی کیا ہے؟ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت آپ نے افریقہ کے لیے رخت سفر باندھا اس وقت آپ نے اہل وعیال کو یہیں چھوڑ دیا تھا۔ مولانا فضلی مشہدیؒ بیان کرتے ہیں:

منہمک تھے اس کی خاطر روز وشب حد سے سوا
عزمِ افریقہ کیا پھر چھوڑ کر فرزند وزن

اور چھوڑا بھی کس حال میں! حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ اس کا جواب دیتے ہیں:

''آپ نے اپنی عزیز جان، زن وفرزند کو بے بسی اور بے کسی کی حالت میں چھوڑ کر غربتِ سفر میں شہید ہو کر مالک حقیقی کے سپرد کر دی''۔

(ذکر صالحین ۲/۴۰۶)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وفات کے وقت بھی بانیٔ مرحوم کے پاس اتنی پونجی نہ تھی جو آپ کے ورثا کو خوش حال کرتی؛ مگر دینی خدمات کی برکت ہے کہ آج آپ کی اولاد دینی نعمتوں کے ساتھ ساتھ دنیوی نعمتوں سے بھی مالا مال ہے، اور دنیا

دست بستہ ان کے سامنے کھڑی ہے۔ اللھم بارک لھم فیما رزقتھم واغفرلھم وارحمھم.

یہ عجیب بات لگتی ہے کہ مولانا فضلی مشہدیؒ کا بیان ہے: ''عزمِ افریقہ کیا پھر چھوڑ کر فرزند وزن'' اور مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں؛ مگر دوسری طرف مولوی زکریا افریقی کا بیان ہے کہ: ان کی دادی امۃ الغفران (بانیٔ مرحوم کی سب سے چھوٹی صاحب زادی) آپ کے انتقال کے وقت افریقہ میں موجود تھیں، عمر ۳؍سال تھی، اور مقامی علما وصلحا نے ان کے سر پر ہاتھ بھی پھیرا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ان کی پیدائش بانیٔ مرحوم کے سفرِ افریقہ کے درمیان ہوئی تھی، تبھی تو بہ وقتِ وفات ۳؍سال کی عمر تھی؛ اس لیے کہ آپ کا قیام افریقہ میں ۳؍ہی سال رہا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ سفر میں ساتھ تھیں۔ ان دونوں خبروں میں بہ ظاہر تعارض نظر آتا ہے؛ مگر تطبیق کی صورت یہ نکل سکتی ہے کہ پہلے خود تنہا افریقہ چلے گئے، پھر وہاں پہنچ کر سہولت میسر آنے پر اہلِ خانہ کو بھی بلوالیا۔

بانیٔ مرحوم کی روحانی اولاد تو دنیا میں بے شمار ہوں گی، ان ہی کے ذریعے آپ کی خدمات زندہ وتابندہ ہیں، اور ان شاء اللہ صبحِ قیامت تک رہیں گی۔ آپؒ کو اللہ نے نسبی اولاد سے بھی نوازا تھا، آپ کے تین فرزندِ ارجمند اور دو دخترِ نیک اختر تھیں۔ سب سے بڑے مولانا عبدالکافی پھر مولانا عبدالباقی، پھر امۃ السبحان (بی بی خالہ) پھر مولانا عبدالشافی اور سب سے چھوٹی امۃ الغفران تھیں۔

پسری اولاد:

(۱) مولانا عبدالکافی: بانیٔ مرحوم کی اولاد میں سب سے بڑے تھے، شاید جوانی میں انتقال کر گئے، اس لیے نہ ہی آپ کے احوال ملتے ہیں نہ ہی آپ سے بانیٔ مرحوم کا سلسلۂ نسل آگے چلا۔

(۲) مولانا عبدالباقی: آپؒ نے ابتدائی تعلیم پالنپور میں اپنے والد کے دوست اور رفیقِ درس حضرت مولانا نذیر میاں صاحبؒ کے یہاں حاصل کی، اس کے بعد دیوبند چلے گئے۔

سوانح نذیری میں ہے: مولانا احمد حسن بھامؒ نے اپنے صاحب زادے مولوی عبدالباقی صاحب کو حضرت مولانا محمد نذیر میاں صاحبؒ کے پاس علم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجا تھا، جو کئی سال تک یہاں رہ کر علم حاصل کرتے رہے۔ (سوانح نذیری ۱/ ۳۴۸)

حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ مولانا نذیر میاں صاحبؒ کے بارے میں فرماتے ہیں: آپ مسلسل پچاس سال سے للہ فی اللہ دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اس نہایت جفاکش مردِ مجاہد نے جگہ جگہ مدارس ومکاتب قائم کر کے پالنپور اور اس کے ملحقہ علاقے کو علم سے مالا مال کر دیا۔ تعلیمِ بالغان کے سلسلے میں ملازم پیشہ، مزدور پیشہ کم فرصت لوگوں کو ان کی فرصت کے اوقات میں، کسی کو عشاء کے بعد، کسی کو رات بارہ بجے اور بعضوں کو صبحِ صادق کے قبل پڑھا

پڑھا کر عالمِ دین بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بابرکت اور بافیض ہستی کو تادیر سلامت باکرامت رکھے۔ آمین (ذکرِ صالحین: ۲/ ۴۰۴) ۲۰/رمضان ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۶ء کو بروز پنج شنبہ آپؒ کی وفات ہوئی ہے۔

مولانا عبدالباقی کے بارے میں حضرت مولانا ازہر شاہ قیصرؒ لکھتے ہیں: ان کی تعلیم کا ایک حصہ ۱۳۴۴ھ میں دیوبند میں پورا ہوا۔ یہ جوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے، شاید نکاح کی نوبت بھی نہیں آئی؛ اس لیے آپ سے سلسلۂ اولاد جاری نہ ہوا۔

(۳) مولانا عبدالشافیؒ: آپ کے بارے میں مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ قمطراز ہیں: دوسرے (بیٹے) مولوی عبدالشافی صاحب مرحوم تھے، جنہوں نے جامعہ میں تعلیم حاصل کی تھی، اور پھر جامعہ ڈابھیل میں معلم رہے، انہوں نے جامعہ میں تقریباً پندرہ یا سترہ سال خدمت انجام دی ہے، کتب خانے میں بھی کام کیا ہے اور درس وتدریس کا بھی کام کیا ہے، اور ''مجلسِ خدّام الدین'' کے ساتھ بھی ان کے گہرے تعلقات تھے، مجلس کی بنیاد سے لے کر زندگی کے آخری حصے تک وہ برابر مجلس کی خدمت انجام دیتے رہے، بعد میں اس سلسلے میں انگلینڈ چلے گئے، کم وبیش پچیس برس وہاں رہے۔ پھر ۱۹۷۴ء میں واپس آکر سملک میں انتقال فرمایا۔ مولوی عبدالشافی نہایت بلند حوصلہ اور باوقار انسان تھے، راقم جب ڈابھیل میں پڑھتا تھا تو شافی صاحب مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے، بہت محبت کرتے تھے، اور ساری عمر انہوں نے محبت اور مودّت کے ساتھ تعلقات کو نبھایا۔ (ماہنامہ دارالعلوم بحوالہ بانیٔ جامعہ نمبر: ۵۲، ۵۳)

ان ہی کے متعلق حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہؒ مہتمم جامعہ حضرت مولانا احمد بزرگؒ کو اطلاع دیتے ہوئے اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''اس سال (ذی قعدہ ۱۳۵۶ھ، جنوری ۱۹۳۲ء) عبدالشافی صاحب نے تعلّم کا قصد کیا ہے اور دوسری جماعت عربی میں جانے لگے ہیں، صبح دو گھنٹہ تعلّم میں وقت دے رہے ہیں، اور اس کے بعد خود اسباق میں جاتے ہیں، اس کے بعد اردو کے درجے میں آکر بیٹھتے ہیں، اس طرح اِس وقت کام چل رہا ہے''۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں: ''اردو عبدالشافی کے پاس ہے''۔ (نقوشِ بسم اللہ ۱/ ۱۵۸، ۱۶۴)

''تاریخِ جامعہ'' میں اساتذہ کے ناموں کے ضمن میں بھی آپ کا نام ملتا ہے، اس کے اعتبار سے آپ نے ۱۳۵۲ھ سے ۱۳۵۶ھ تک خدمت کی ہے، اس دوران آپ ناظمِ کتب خانہ رہے اور پھر مدرسِ اردو ہوئے۔ (تاریخِ جامعہ: ۴۶۸)

''تاریخِ جامعہ'' میں اس مقام پر آپ کے نام کے ساتھ ''مولانا، مولوی یا حافظ'' وغیرہ کا اضافہ نہیں ہے، صرف ''عبدالشافی صاحب ولد مولانا احمد حسن بھام'' لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک آپ کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی، پھر پتہ نہیں آپ نے کب اور کہاں تعلیم کی تکمیل کی؟ اس لیے کہ ''تاریخِ جامعہ'' میں موجود فضلا کی فہرست میں آپ کا نام نہیں ملتا۔

ایک بات قابلِ لحاظ ضرور ہے کہ، تاریخِ جامعہ میں مذکور سنین کے اعتبار سے آپ کی مدتِ خدمت ۴ رسال نکلتی ہے، اور مولانا ازہر شاہ قیصرؒ پندرہ یا سترہ

سال لکھتے ہیں، شاید مولانا نے مجلسِ خدّام الدین کی خدمات کو بھی اسی میں شمار کرلیا ہوگا۔ واللہ اعلم

ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اپنے پڑھنے ہی کے زمانے میں پڑھانا بھی شروع فرمادیا تھا، تحصیلِ علم کا یہی طرز حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔ الحمدللہ بانیٔ مرحوم کے اس فرزند نے اس طرزِ تعلیم کو یہاں زندہ کردکھایا۔

ان کا نکاح اپنی چچازاد بہن خدیجہ ابراہیم بھام سے ہوا۔ کل نو اولادیں چھوڑی ہیں: (۱) رشید احمد (۲) حسن احمد (۳) حافظ عبدالکافی (اپنے چچا کے ہم نام ہیں) اور عرف میں خلیل احمد سے مشہور ہوئے، بانیٔ مرحوم کی اہلیہ محترمہ کے زیورات خرچ کرنے کے واقعہ کے راوی یہی ہیں، (۴) رقیہ (۵) احمد (اپنے دادا کے ہم نام ہیں)، (۶) ابراہیم (۷) حافظ ابوبکر (۸) حبیبہ (۹) حافظ عبدالباقی (اپنے چچا کے ہم نام ہیں، اور مولانا بھاٹلا سے مشہور ہیں)۔

مولانا عبدالشافی چوں کہ انگلینڈ چلے گئے تھے، اس لیے آپ کی اولاد آج بھی انگلینڈ میں آباد ہے اور مختلف طرز سے دینی خدمات انجام دے رہی ہے۔

دخترِی اولاد:

(۱) امۃ السبحان (بی بی خالہؒ): آپ کی یہ صاحب زادی حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہؒ کے بھائی مولانا یوسف بسم اللہؒ کے نکاح میں تھیں، جنھوں نے

ایک طویل زمانے تک جامعہ کی خدمت کی؛ مگر بعد میں مفقود الخبر ہو گئے تھے، چوں کہ آپ پر جذب کا رنگ غالب تھا؛ اس لیے ہوسکتا ہے کہ کسی مجذوب کے پیچھے کہیں چلے گئے ہوں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: نقوش بسم اللہ ۱/ ۸۸)

بانیٔ مرحوم کی یہ دختر ''بی بی خالہ'' سے معروف تھیں، مفتی اسماعیل بسم اللہ صاحبؒ کے حفیدِ محترم حضرت الاستاد مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم سے راقم السطور نے خود سنا کہ بڑی دیندار تھیں، ہماری دادی اماں سے ملنے کے لیے آیا کرتی تھیں، ہر وقت زبان پر ذکر جاری رہتا تھا، بالکل بھولی بھالی، غِرٌّ کریمٌ کا نمونہ تھیں، لڑائی جھگڑوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، ان کے شوہر مفقود الخبر ہو گئے تھے، اس کے باوجود پوری زندگی تجرد کی حالت میں انتہائی عفّت و پاکدامنی کے ساتھ گزاری، دراز عمر پائی تھی، جامعۃ القراءات کفلیتہ کے افتتاح کے وقت موجود تھیں۔

حضرت مفتی عبد القیوم صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

راقم الحروف کی اہلیہ سے بی بی خالہ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ میرے شوہر خواب میں آئے اور کہا: بی بی صبر کر۔ (نقوشِ بسم اللہ ۱/ ۹۱)

ان کی دو اولاد ہوئیں: (۱) رشید (۲) رشیدہ؛ مگر ان سے بھی آگے نسل نہ چلی۔

(۲) امۃ الغفران: یہ دوسری دختر تھیں، ان کا انتقال ۱۹۷۰ء میں افریقہ میں ہوا، آپ اپنے والد کے ساتھ افریقہ میں مقیم تھیں، ہمارے مولوی زکریا ان ہی

کے پوتے ہوتے ہیں، ان کے کہنے کے مطابق بانیٔ مرحوم کی وفات کے وقت ان کی عمر تین سال کی تھی، اسی موقع پر افریقہ کے علما وصلحا نے آپ کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

ان کا نکاح اپنے چچازاد بھائی عبدالہادی بن ابراہیم بھام سے ہوا، آٹھ اولاد یادگار چھوڑی ہیں:

(۱) فاطمہ، (۲) عائشہ، (۳) ابراہیم (اپنے دادا کے ہم نام)، (۴) محمد انور، (۵) حافظ زکریا، (۶) زبیدہ، (۷) مولانا یحییٰ (بانیٔ مرحوم کی وفات کے وقت کے احوال کے راوی مفتی زکریا بھام ان ہی کے فرزند ہیں)، (۸) سعیدہ۔

محترمہ امۃ الغفار انؒ کی اولاد افریقہ میں مقیم ہیں، اور وہاں بھی مختلف میادین میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح بانیٔ مرحوم کی خدمات سے براہِ راست تین برِ اعظم ایشیا یورپ اور افریقہ آج بھی بہ یک وقت فیض یاب ہو رہے ہیں، اور بالواسطہ فیض رسانی کا سلسلہ تو دنیا کے کونے کونے تک پھیلا ہوا ہے۔

حضرت مفتی محمود صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

مادرِ علمی (جامعہ ڈابھیل) کی برکت سے الحمدللہ دنیا کے پانچوں برِ اعظم (ایشیا، یورپ، افریقہ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ) کے دینی اسفار کیے اور کر رہا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کرواتے رہیں، میں نے پانچوں برّ اعظموں میں جامعہ کا فیض اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ (بانیٔ جامعہ:۵۹)

حضرت مولانا قاری محمد یامین صاحبؒ اسی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے

ہیں:

من الخلق داعٍ مخلص الحب دائم	۞	سوى فيضه شرقا وغربا وكم له

ترجمہ: ان کا فیض مشرق ومغرب میں عام ہوا کتنی ہی مخلوق ہمیشہ کے لیے ان سے سچی محبت کرنے والی دعا گو ہے۔

یہ تھے بانیٔ مرحوم کے چند منتشر احوال جن کو اپنی بساط کے مواقف مرتّب کر کے پیش کرنے کی سعی کی گئی، اس سعی میں کامیابی کہاں تک ملی؟ اس کا فیصلہ اہلِ نظر وارباب بِصیرت کے حوالے!۔ یقیناً ان احوال وواقعات میں بے شمار درسِ عبرت موجود ہیں۔ حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ- جنھوں نے بانیٔ مرحوم کو بہت قریب سے دیکھا، برتا اور آزمایا تھا- آپؒ کی زندگی کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

''مولانا احمد حسن صاحب بھام مرحوم نے مذہب وملّت اور علومِ دینیہ کی خدمت کر کے جو نمونہ عالمِ اسلام کے لیے پیش کیا ہے، وہ نہایت اہم اور سبق آموز ہے''۔ (ذکر صالحین ۲/۴۰۶)

یہ سطور حضرت مولانا لاجپوریؒ کے اِن ہی جملوں کی گویا شرح تھیں، جو اللہ کے فضل سے اپنی انتہا کو پہنچی۔

والحمد للّٰہ أولاً وآخراً، والصلاة على سيد المرسلين، وعلى آله وصحبه أجمعين. اللهم تقبل منا مساعينا واجعلها الخالصة وجهك الكريم.

اٰمین یارب العالمین

العبد الضعیف الراجی إلیٰ عفو ربہ الکریم

عبد العلیم امراوتی

متعلم: عربی ہفتم، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

۵ رجب المرجب ۱۴۳۷ھ بروز بدھ بعد نمازِ عصر

مرثیہ

بروفاتِ حسرت آیات مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ

از: حضرت مولانا تجمل حسین فضلی مشہدیؒ بھروچی

یکے از رفقائے حضرت مرحوم سملکی

ہے سبق آموز عبرت خیز دنیا کا چلن	۞	ہے زوال ولافنا ہے ذاتِ باری ذوالمنن
گل ہوئی وہ شمع صد افسوس کہ جس کے سبب	۞	بن گئی اندھیر خانہ دوستوں کی انجمن
نام تھا احمد حسن اور بھام تھا جن کا لقب	۞	قوم کے پیچھے کھپایا جس نے اپنا جان وتن
خادمِ اہلِ وطن تھے مولوی احمد حسن	۞	ماہرِ علمِ شریعت، زینتِ بزمِ سخن
طالبِ علمانہ وہ ہندوستان میں پھرتے رہے	۞	رہنمائی کے لیے ملتے تھے شیخ وبرہمن
جب سیاحت سے تھکے ماندے ہوئے ہیں آپ تب	۞	کانپور آخر ہوا ان کے لیے مثلِ وطن
بعد اس کے شہرِ دہلی میں رہے ہیں مدتوں	۞	یعنی وہ دہلی جو واقع ہے بدریائے جمن
کتنی تکلیفیں اٹھائیں جستجوئے علم میں	۞	منزلیں تحصیل کی بے شک ہیں ایسی ہی کٹھن
اپنی بستی کے لیے کی وقف ساری عمر کو	۞	آپ حاصل کر چکے جس وقت کہ ہر علم وفن
از پئے تعلیمِ دیں تھے بانیٔ دارالعلوم	۞	موضعِ ڈابھیل سملک میں جو تھا خود کا وطن
منہمک تھے اس کی خاطر روز وشب حد سے سوا	۞	عزم افریقہ کیا پھر چھوڑ کر فرزند وزن
جابجا اس کے ہی ذکر وفکر میں مصروف تھے	۞	راہ میں اس کے لیے کیا کیا سہے رنج ومحن

سب سے یکساں گفتگو تھی سیٹھ ہو یا ہو فقیر	۞	خیر خواہی سب کی تھی مدِّ نظر سرّ وعلَن
قلب میں تھا درد علم دین کی ترویج کا	۞	بچوں کی تعلیم کی رکھتے تھے سینہ میں لگن
سادگی سے تھے ملبس، تھے تصنع سے بری	۞	ان کے جیسے اور کم دیکھے گئے اہلِ زمن
قوم کی وہ خدمتیں کی ہیں کہ جس کی شرح سے	۞	واقعی سچ کہہ رہا ہوں بند ہے میرا دہن
انتقالِ پُرملالِ صادق الاخلاص سے	۞	آج ثابت ہوگئی دنیا مجھے دارالحزن
حق کی مرضی یوں ہی تھی کیا کیجیے جز صبر کے	۞	سامنے تقدیر کے بیکار ہے سارا جتن
گیارہویں ماہِ محرم روز پنج شنبہ کا تھا	۞	قبل مغرب چھپ گیا زیرِ زمیں ان کا بدن
یا الٰہی! مغفرت کی چادریں ان پر چڑھا	۞	وقف اس کے واسطے کر اپنی رحمت کے چمن
مصرعِ تاریخ فضلی مشہدی نے یوں کہا	۞	جنتی تھے مولوی عالی ہمَم احمد حسن

(۱۳۳۷)

هذه القصيدة في مدح قدوة العلماء الراسخين فقيد المثال في الزمن

مولانا أحمد حسن السملكي

مؤسس الجامعة الإسلامية رزقه الله عيشة راضية في جنات عالية

از قاری محمد یامین سہارن پوری

مدرس شعبۂ تجوید جامعہ اسلامیہ

أيا عين جُودِي بالدموع السّواجِم	۞	على موتِ شيخٍ باهرِ المجدِ كارمٍ
حميدٍ نشأفي خدمة الدين مخلصاً	۞	فقام بجد ثم صدق العزائم
حنيفٍ نبيل بارع متورع	۞	حريص على الطاعات لله صارمٍ
دُجىٰ منكرات الشرع زالت بنوره	۞	فبسّط أنوار العلىٰ والمكارم
حَمَى الملة البيضاء في طول عمره	۞	ولم يَألُ جهدا في احتمال العظائم
سَمَا بجمال ثم نفس شَهامةٍ	۞	وشيد أركان الهدىٰ والمعالم
نسيمَ الصبا بلِّغْ إليه تأدبا	۞	تحياتنا من كل بَر وآثم
سَرىٰ فيضُه شرقا وغربا وكم له	۞	من الخلق داع مخلص الحب دائم
مَدَى الدهرِ تبقىٰ باقياتٌ مآثرا	۞	ولا سيما للدين مثل الدعائم
لوىٰ جنبه عن كل غر مكابر	۞	وصبّر من صافاه عند التزاحم
كذي منصب التجديد أمضىٰ عزيمة	۞	فما خاف غيرَ الحق لومة لائم
يهون علىٰ عبد منيب مُصمّمٍ	۞	أمورٌ صعاب لا تُرام لرائم

فذاک النبیل الشیخ أحمد حسن له	۞	ثناء جمیل حَلَّ کل الأقالم
فجازاه رب العالمین بلطفه	۞	جزاءٍ یُوفیٰ من لدن خیر راحم
وأکرم مثواه من الخلد مُرضیاً	۞	بجاه النبي المصطفیٰ ذي المراحم
فصلیٰ علیه اللّٰه ربي وسلما	۞	إلیٰ ما جلا الأشجان صَدح الحمائم

(منقول از روداد ۵۰ھ ص:۹)

مراجع ومصادر

نمبر شمار	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	مطابع
۱	تاریخ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل	مولانا فضل الرحمن اعظمی مدظلہ	ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان
۲	اکابرینِ گجرات (گجراتی)	مولانا عبدالحی کفلیتوی	ادارہ اشاعتِ کتب، کفلیتہ
۳	بیس بڑے مسلمان	عبدالرشید ارشد	مکتبہ رشیدیہ، لاہور
۴	سوانح صوفی سلیمان		صوفی منزل، لاجپور
۵	ذکرِ صالحین	مولانا مرغوب احمد لاجپوری مدظلہ	جامعۃ القراءات، کفلیتہ
۶	نقوشِ بسم اللہ	مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی	// //
۷	نقوشِ بزرگاں	// //	دارالنشر العلمیہ، سملک
۸	مقدمۂ محمود الفتاویٰ	// //	مکتبۂ انور، ڈابھیل
۹	تعارفِ جامعہ	// //	جامعہ تعلیم الدین، ڈابھیل
۱۰	۳۰ر فضلائے جامعہ	// // //	// //
۱۱	اجلاسِ صدسالہ	// // //	// //
۱۲	مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ	مولانا حفیظ الرحمن واصف	مدرسہ امینیہ، دہلی
۱۳	بانیٔ جامعہ نمبر	.....	شعبۂ تقریر وتحریر ڈابھیل
۱۴	تذکرۂ فخرِ گجرات	مفتی رشید احمد فریدی	مدرسہ مفتاح العلوم، تراج
۱۵	الواح الصنادید	مولوی عطاء الرحمن قاسمی	مولانا آزاد اکیڈمی، دہلی
۱۶	اضواء (عربی)	مولانا عبداللہ کاپودروی مدظلہ	مجلس المعارف، کاپودرا

۱۷	رشد وہدایت کے مینار	// //	// //
۱۸	کاروانِ حیات	مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ	فرید بک ڈپو، دہلی
۱۹	سوانحِ نذیری	مولانا عبدالقیوم پالنپوری	مجلس دعوۃ الحق، پالنپور

خراجِ عقیدت

بہ خدمت اقدس حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ

نتیجۂ فکر: معاذ کولہاپوری
متعلم: جامعہ ڈابھیل

اے رہ علم کے رہبر ورہنما	۞	تیری محنت سے قائم ہوا جامعہ
کس طرح شکر تیرا کریں ہم ادا	۞	اے چراغِ ہدیٰ بانیٔ جامعہ!
قمریوں کے لبوں پر ہے مدحت تری	۞	طوطیوں کی زباں پر ثناء ہے تیری
عندلیبانِ گلشن ثناء خواں تری	۞	اے چراغِ ہدیٰ بانیٔ جامعہ!
ناشرِ علمِ دیں ہے یہ گلشن ترا	۞	چار سو ضَو فشاں ہے چمن یہ ترا
ہے یہ احسان سارے جہاں پر ترا	۞	اے چراغِ ہدیٰ بانیٔ جامعہ!
تو ہے شمس العلوم ومہِ ساطعہ	۞	نور کا تیرے پرتو ہے یہ جامعہ
تو ہے خورشید ومہ پارۂ لامعہ	۞	اے چراغِ ہدیٰ بانیٔ جامعہ!
ظلمتِ جہل میں علم تھا لاپتہ	۞	ضَو سے تیری ملا علم کا راستہ
تو رہِ علم میں نیّرِ تافتہ	۞	اے چراغِ ہدیٰ بانیٔ جامعہ!
اپنی عزت کی پرواہ کو چھوڑ کر	۞	تو نے ہر گھر سے غلہ لیا مشت بھر
اس چمن کے لیے تو پھرا در بدر	۞	اے چراغِ ہدیٰ بانیٔ جامعہ!
چھوڑ کر دیس پردیس تو تھا گیا	۞	پھر نہ لوٹا وہیں جاں بحق ہوگیا

اِس چمن کے لیے تو نے کیا کیا کیا		اے چراغِ ہدیٰ بانیٔ جامعہ!
ابرِ رحمت سدا تجھ پہ باراں رہے		نورِ حق سے تری قبر رخشاں رہے

تجھ سے رب خوش رہے تو بھی شاداں رہے
اے چراغِ ہدیٰ بانیٔ جامعہ!